دیکھیں پاپا!

(افسانے)

جمشید مرزا

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

دیکھیں پاپا!

(مختصر افسانے)

جمشید مرزا

دوسرا ایڈیشن

"ہم آپ کو بھولے نہیں" نئے نام "دیکھیں پاپا!" اور چند ترمیمات کے ساتھ مصنف کے مشورہ سے شائع کیا جا رہا ہے۔

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

DEKHEIN PAPA!

(SHORT STORIES)

By

JAMSHED MIRZA

1998

ISBN 81_86232_64_8

Price Rs. 125

5.00 پانچ پاؤنڈ

$ 10.00

سنہ اشاعت : 1998

دوسرا ایڈیشن : "ہم آپ کو بھولے نہیں" کا نیا نام "دیکھیں پاپا!"

قیمت : 125 روپے

: مغربی ممالک میں پانچ پاؤنڈ دس ڈالر

مطبع : ایس کمپیوٹرس چسلا گیٹ چاوڑی بازار دہلی 6

ملنے کا پتہ

پاکستان میں

294/8_Azizabad Fedral_B Area, Karachi

انگلستان میں

244, Balmoral Drive Hayes, Middx, London UB4_0AA

Published by

Educational Publishing House

3108 Gali Azizuddin Vakil Kucha Pandit

Lal Kuan Delhi-6

انتساب

محبت کے نام

فہرست

دیباچہ

جمشید مرزا کو اپنی اولین کہانی لکھتے وقت جو Excitement ہورہی ہوگی کم و بیش اسی کیفیت سے ہم خود اس وقت گذر رہے ہیں کیونکہ زندگی میں پہلی بار کوئی دیباچہ، تقریظ یا پیش لفظ لکھنے کی سعادت نصیب ہورہی ہے۔ یہ دیباچہ اس لحاظ سے بھی انتہائی اہم ہے کہ دراصل اس کو تحریر کرنے کی ذمہ داری بزرگوار محترم مشتاق احمد یوسفی کو سونپنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ بوجوہ اسے نہ لکھ پائے ان وجوہ میں ان کی طویل علالت، ادل کے آپریشن اور وطن واپسی کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی شامل تھا کہ ایک مزاح نگار کے دیباچہ کو لوگ سنجیدگی سے نہیں لیں گے اور اس خدشے کا اظہار خود یوسفی صاحب نے بھی کیا تھا۔ ہمارے والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ صحافت میں ان کی آمد محض اس حادثے کا نتیجہ تھی کہ مولانا ظفر علی خاں ایک روز بوجوہ روزنامہ "زمیندار" کا اداریہ نہ لکھ پائے اور اپنے پروف ریڈر کو اطلاع بھجوائی کہ آج اداریہ تم لکھ دو ہمارے والد صاحب نے ڈرتے ڈرتے اداریہ لکھ دیا اور اس طرح وہ راتوں رات ایک معمولی پروف ریڈر سے زبردست صحافی بن گئے ہم نے بھی ڈرتے ڈرتے یہ دیباچہ لکھنا شروع کیا ہے اور ہمارے مہربان دوست شاہد ملک نے ہماری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر ہم اس دیباچے کی اشاعت کے بعد یوسفی صاحب کی طرح مشہور نہ بھی ہوئے تو کم از کم دیباچہ ضرور ڈاکٹر جانسن کی ڈکشنری کے دیباچے جیسا مشہور ہوجائے گا۔ اگرچہ ہم نے نہ تو وہ ڈکشنری دیکھی ہے اور نہ دیباچہ لیکن انگریزی ادب کے ایک مدرس نے حوالہ دیا ہے تو یقیناً کوئی معرکے کی چیز ہوگی۔ بہرحال اس

تحریر کا مقصد چونکہ پدرم سلطان بود سے زیادہ "دوستم افسانہ نگار است" ہے اس لئے آیئے۔ جمشید مرزا کی کہانیوں پر ایک نگاہ ڈال لی جائے اور مناسب ہوگا کہ پریم چند سے انور خان تک کے کہانی نگاروں کی تاریخ کھنگالنے کی بجائے براہ راست جمشید مرزا کے افسانوں کی بات کی جائے۔

یہ افسانے ایک حساس انسان کے دل کی گہرائیوں سے اٹھی ہوئی صدائیں ہیں ان میں موضوعات کا تنوع ہے۔ کرداروں کی رنگا رنگی ہے اور زندگی کے بوقلموں پہلوؤں کی عکاسی ہے۔ ان کہانیوں کا بیان کرنے والا جس کے لئے مصنف نے اکثر واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ ایک معاشرے سے اکھڑ کر دوسرے معاشرے میں قدم جمانے کی کوشش کرتا ہوا ایک ایسا کردار ہے جس کی جد و جہد ختم ہونے میں نہیں آرہی جن دیواروں کو پھلانگ کر وہ ایک آزاد معاشرے میں آیا تھا یہاں وہی پابندیاں اور مجبوریاں کئی گنا بڑی ہو کر اس کا راستہ روک لیتی ہیں اور پھر وطن واپسی بھی اس درد کا مداوا نہیں بن سکتی۔

"جب میں وطن چھوڑ کر انگلینڈ گیا تو وہاں صرف ایک دیوار تھی، دیار غیر میں تنگ دلی کی اور دیواریں دیکھیں واپس آیا تو اپنے ملک میں دیواریں ہی دیواریں نظر آئیں مگر اب اتنی عمر گذرنے کے بعد سوچتا ہوں کہ ان دیواروں سے انسان کہاں بھاگ سکتا ہے" (پس دیوار)

یہ حقیقت پسندی اور حالات کے جبر کو تسلیم کر لینے کی ہمت دیگر کہانیوں میں بھی اجاگر ہوتی ہے کہانیوں کے وہ حصے خاص طور پر قاری کی توجہ مبذول کرتے ہیں جہاں مصنف کا مشاہدہ عروج پر ہے۔ جمشید مرزا نے تصورات کے رنگ محل تعمیر نہیں کئے اور نہ ہی تخیل کے موقلم سے کسی انوکھی ان جانی دنیا کے پیکر تراشے ہیں انہوں نے تو ہمارے ارد گرد جیتی جاگتی زندگی کو اپنے لفظوں میں قید کر لیا ہے گہرے مشاہدے کی ایک مثال دیکھئے۔

"ان شادی شدہ لوگوں میں ایسے مردوں کی تعداد زیادہ تھی جن کی بیویاں بچے پیدا کرنے کے بعد اپنی نسوانی کشش کھو چکی تھیں اور گھر کی باعزت خواتین لگنے کی بجائے نوکرانیاں معلوم ہوتی تھیں وہ اپنے جسم ملباس اور گفتگو سے بھی لاپرواہ ہوگئی تھیں۔ حالاں کہ وہ وفادار تھیں، گھر کے فرائض بخوبی سرانجام

دے رہی تھیں مگر شاید مرد عورت سے کہیں زیادہ حسن پرست اور عشق کا دلدادہ ہے۔" (پھر ہوا کیا)

اگر غور کیجئے تو اس آخری جملے میں مصنف نے مشرق و مغرب کے تمام مردوں کے تمام ترنفسیات کو چند لفظوں میں سمو کے رکھ دیا ہے۔ عشق و محبت اور عقل و شعور کے بارے میں مصنف کے چند اور اقوال بالکل افورزم Aphorism کی تیزی اور کاٹ رکھتے ہیں اور کچھ عجب نہیں کہ چند برسوں بعد عالمی Aphorisms کا درجہ حاصل کرلیں۔ اسی کہانی (پھر ہوا کیا) کا یہ حصہ ملاحظہ فرمایئے۔

"انسان بنیادی طور پر خود غرض ہے۔ بہت کم ہیں جو اخلاق اور محبت کی سرحدوں کو سمجھتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے ہوں۔ اخلاق ریاکاری اور محبت میں فرق ہے کسی کے لئے جگہ چھوڑ دینا ذہن صاف ہونے کے ساتھ تحائف دینا اخلاق ہے مگر اس کے بدلے میں کسی گناہ یا ناجائز معاوضے کی امید کرنا ریاکاری ہے۔ کسی کی تکلیف کو تکلیف سمجھنا یہ محبت ہے۔ کسی کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دینا یہ قربانی ہے۔ اپنے اور پرائے کے فرق کو سمجھنے کے لئے عقل و شعور کی ضرورت ہے۔ عقل و شعور حاصل کرنے کے لئے اپنے اندر دیانت داری پیدا کرنی پڑتی ہے لیکن عقل اور چالاکی میں بھی فرق ہے۔ چالاکی اپنی غرض وغایت کے لئے جائز اور ناجائز طریقے استعمال کرتی ہے اور شر پھیلاتی ہے عقل سچائی کی تلاش میں رہتی ہے اور امن چاہتی ہے۔"

اس قدرے طویل اقتباس کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ مصنف کے اخلاقی، سماجی اور معاشرتی و ثقافتی نظریات کا انتہائی جامع اظہار ان سطور میں موجود ہے اور آج کے زمانے میں جب تمام تر اخلاقی اور انسانی اقدار کا خاتمہ ہو رہا ہے ایک مصنف کا بنیادی انسانی اخلاقیات سے جڑے رہنے کا اعلان انتہائی اہم ہے۔

جمشید مرزا کے فن کا مطالعہ کرتے ہوئے ناقدین کو جو پہلو سب سے زیادہ متاثر کرے گا وہ کردار نگاری پر ان کی ماہرانہ دسترس ہے وہ چند ہی لفظوں میں کردار کا ایسا نقشہ کھینچ دیتے ہیں کہ جیتی

جاگتی شخصیت، ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

"وہ خوش شکل، پڑھی لکھی اور اردو ادب میں دلچسپی رکھتی تھیں چہرے پر شرافت خوش خلقی اور معصومیت تھی کوئی بھی مرد انہیں دیکھتا تو دل میں ایک احترام محسوس کرتا، لباس میں انفرادیت اور سلیقہ تھا۔ وہ خاندانی خاتون تھیں" (پھر ہوا کیا)

اس کے بعد مصنف نے قدرے تفصیل سے لفظ "خاندانی" کی وضاحت بھی کر دی ہے کہ پڑھنے والا کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے قاری کو ہر لمحے دھیان میں رکھنا، جمشید مرزا، اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں کیونکہ وہ کسی خیالی دنیا میں بیٹھ کر خیالی قارئین کے لئے خیالی کہانیاں نہیں گھڑ رہے بلکہ روزمرہ کی تلخ حقیقتوں کا پردہ چاک کر رہے ہیں اور ہمارے اردگرد چلتے پھرتے گوشت پوست کے زندہ انسانوں کے سچے واقعات ہمیں سنا رہے ہیں مصنف کے نزدیک، چہروں کا مطالعہ کرنا ایک فطری بات ہے۔

"ہر چہرہ اپنے ساتھ ایک افسانہ یا داستان لئے ہوتا ہے۔ ان میں کتنی ہی کہانیاں سبق آموز بھی ہیں اور تلخ بھی مضحکہ خیز بھی اور قابل رشک بھی" (چہرے)

اور افسانوں کے اس مجموعے کو پڑھتے ہوئے آپ ان سب چہروں کو باری باری دیکھ سکیں گے یہ محض لڑکوں لڑکیوں کی محبت کے افسانے نہیں ہیں۔ ان میں بیٹی سے بچھڑنے والے باپ کے جذبات بھی ہیں۔ اور نو بیاہتا جوڑے کے دلوں میں انگڑائیاں لیتے جوالا مکھی کی اٹھان بھی

"ہم دیر تک باتیں کرتے رہے اور اس قیمتی وقت سے جنسی فائدہ بھی اٹھاتے رہے" (میری خواہش پر)

اس میں ساس اور بہو کی ازلی اور ابدی نفرت بھی موجزن ہے اور ایک مظلوم شوہر کی دکھ بھری داستان بھی جو دو مشاق کھلاڑیوں کے درمیان ٹینس کے ایک گیند کی طرح ٹھوکریں کھا رہا ہے (میری خواہش پر)

اور اگرچہ اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ مجھے قاری اور کہانیوں کے درمیان سے ہٹ جانا چاہئے تاکہ پڑھنے والے براہ راست، جمشید مرزا کی تحریر سے لطف اندوز ہو سکیں لیکن جاتے جاتے

اپنی ایک حیرت کا اظہار ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ اتنے گمبھیر موضوعات پر قلم اٹھاتے ہوئے بھی جمشید مرزا نے اپنی حس مزاح کو برقرار رکھا ہے۔

اشتیاق نے کہا "ہاں صرف دس پنس"

پولیس والے نے کہا "مجھے یقین ہے کہ دس پنس کے لئے تم پولیس اسٹیشن جاکر رپورٹ کرنا پسند نہیں کرو گے۔"

اشتیاق نے کہا "ہو سکتا ہے دس پنس یہیں کہیں گھاس پر گر پڑے ہوں۔

"ہو سکتا ہے" پولیس والے نے بھی کہا۔ پھر کہنے لگا "اگر میں تمہاری جگہ پر ہوں تو تمہاری عمر میں اس جگہ اس وقت جاگنگ کرنے نہ آؤں" پھر پوچھنے لگا۔

"کہاں سے آئے ہو؟ یعنی لندن میں کس علاقے سے آئے ہو۔ اشتیاق نے جواب دیا "کراچی سے" پولیس والا ہنس کر بولا "جاگنگ کرتے ہوئے بہت دور نکل آئے ہو" (ہائیڈ پارک)

عارف وقار

بی بی سی اردو سروس

لندن

تخلیقی سفر

اس عمل کی ابتداء کا وقت اور جگہ تو صحیح یاد نہیں صرف اتنا یاد ہے کہ حالات بدلتے رہے۔ زمینیں بدلتی رہیں، حساس طبیعت اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ لکھواتی رہی۔ مگر سنجیدگی سے یہ عمل اردو مرکز سے ہی شروع ہوا۔

اردو مرکز لندن 1981 میں قائم ہوا۔ الطاف گوہر تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن کے سربراہ تھے۔ اردو مرکز اس کا ذیلی ادارہ تھا۔ افتخار عارف اس کے جنرل سیکریٹری تھے۔ اکتوبر 1986ء سے جولائی 1990ء تک مجھے بھی اس عظیم ادارہ اور افتخار عارف جیسی شخصیت کے ساتھ کام کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ مغربی ممالک اور خاص طور پر برطانیہ میں اردو کو فروغ دینے والا یہ اہم ادارہ مالی مشکلات کی وجہ سے اگست 1990ء میں بند ہوگیا۔

مجھے اردو مرکز سے منسلک ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ ایک افسانہ نگار جتیندر بلو نے اپنا تعارف کروایا۔ جو پشاور میں پیدا ہوئے کچھ عرصہ بمبئی کی فلم انڈسٹری سے وابستہ رہے۔ اب لندن میں آباد ہیں۔ برطانیہ کے ادبی حلقوں میں وہ ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ میں ان کی صاف ستھری اور حقیقت پر مبنی کہانیاں پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ چند لمحہ میرے سامنے بیٹھ کر سگریٹ کے کش لگاتے رہے میں چائے پیتا رہا۔ موسم سے بات چلی تو اردو ادب، بین الاقوامی سیاست پھر اپنی زندگی کے تجربات ایک دوسرے کو سنانے لگے آدمی کھرے اور بات سننے اور سنانے والے تھے اس لئے کچھ دوستی کی طرح کے مراسم ہوگئے

اپنے کاروبار کے متعلق کچھ تلخ حقائق جتندر بلو کو سنائے۔ جو چند ہفتے پہلے ختم ہوچکا تھا۔ انھوں نے رائے دی کہ میں یہ واقعات قلمبند کروں یہ ایک دلچسپ اور انوکھا موضوع ہے اور یہ کہ آپ اس سے گذرے ہیں اس لئے خود لکھیں، بات آئی گئی ہوگئی۔

چند ہفتے بعد میں نے محسوس کیا کہ اردو ادب کے اس ادارہ میں جہاں پاکستان، ہندوستان، یورپ، روس، امریکہ، کینیڈا کے رسائل، جرائد اور اخبارات کے علاوہ اردو کی اچھی سلیکشن موجود ہے، مجھے پھر سے مطالعہ میں دلچسپی پیدا ہورہی ہے۔

......کچھ لکھنے کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا .... لکھا ...... کاٹا...... پھر لکھا ...... پھاڑ دیا۔ ایک بار پھر لکھا ...... بار بار پڑھا ...... مگر اس میں نفرت اور تعصب کے سوا کچھ نہ تھا ...... کوئی تعمیری پہلو نظر نہ آیا۔ موضوع کا قصور نہ تھا لیکن بات کہنے اور لکھنے میں فرق تھا ...... لکھنے کی پکڑ صحیح نہ تھی ...... اسے ضائع کردیا۔ لکھنے کا جذبہ پیدا ہوچکا تھا۔ ایسا الاؤ جلانے کا کوئی شوق نہ تھا۔ جس کی روشنی میں لوگ صرف مجھے دیکھ لیں۔ اس کی گرمی محسوس ہی نہ کریں یہ الاؤ اندر ہی اندر جلا اور بجھ گیا۔

لیکن گرم راکھ کے نیچے چنگاری پڑی رہی اندر کے سکون کے لئے حساس طبیعت نے طرح طرح کے ذرائع ڈھونڈے اپنے اضطراب اور بے چینی سے نکل کر ایک عام زندگی گذارنے کی کوشش کرتا رہا جس میں آرٹ اور ادب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ماضی کو بھولنا اور حال کے ساتھ سمجھوتہ کرنا کتنا مشکل ہے ..... کسی وقت محبت کی وجہ سے معمولی سی بات بھی برداشت نہیں ہوتی ...... بعض اوقات محبت کی وجہ سے ہی کتنی بڑی بڑی باتیں ہم برداشت کرتے ہیں۔ لیکن اس سے جو ہماری روح مجروح ہوتی ہے۔ اس سے رستے ہوئے خون کو تو کوئی نہیں دیکھتا۔

مختلف قلم کاروں کی کتابیں الٹ پلٹ کرتا رہا، ادبی ذوق رکھنے والی خواتین و حضرات، مقامی اور برصغیر سے آئے ہوئے نقاد، ادبا صحافیوں اور شعراء کو سنا گفتگو ہوئی، ان کی شخصیت کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھنے کی کوشش کی، ان کی عظمت کو پہچانا اور انہیں عام انسان کی حیثیت میں بھی دیکھا اور اس سے بہت کچھ سیکھا۔ جس موضوع پر اپنا علم کم تھا، اسے خاموشی سے سنا، جس بات پر شک تھا یا پورا علم نہ تھا اس کی وضاحت چاہی ...... جس بات سے اتفاق نہ تھا اپنے خیال

کا اظہار کیا۔ اگر کسی کتاب یا کہانی کی کسی نے تعریف کی تو اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر طبیعت میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ پڑھنے کی رفتار کم ہے اور بہت کم تحریریں پسند آتی ہیں۔

زبان سادہ اور اچھی بھی ہو، پہلی شرط کہانی مختصر اور اس میں نیا پن ہو کہانی سچی نہ ہو تو کم سے کم سچی معلوم ہو، کہانیاں صرف تھو فتو کی نہ ہوں بلکہ عام لوگوں اور ہر طبقہ اور ہر پیشے سے تعلق رکھتی ہوں۔ رومان ہو تو اس میں پاکیزگی ہو، پیار میں معصومیت اور روحانیت کا سرور ہو۔ اس میں کوئی عمدہ مزاح ہو یا اس کو پڑھنے سے قاری کو ماضی کے کسی اچھے لمحات کا خیال آئے۔ کوئی ایسا مضمون یا مقالہ جس سے وجدان اور کوئی اچھا کام کرنے کی تحریک پیدا ہو یا پھر اس تحریر کا موضوع، لب و لہجہ کم سے کم ایسا ہو کہ قاری کی دلچسپی قائم رہے۔ لیکن ایسی تحریریں ڈھونڈتے وقت، شاذ و نادر ہی کامیابی ہوتی اردو مرکز صرف لائبریری ہی نہ تھی وہاں ایسے ایسے دانشور، اکابرین اور مشاہر تشریف لائے جنھیں برسوں ڈھونڈتے رہیں تو ان سب سے ملاقات نہ ہو۔ برصغیر سے آئے ہوئے یا اردو مرکز کی دعوت پر بلوائے گئے نقاد یا ادبا، صحافیوں اور شعراء کے اعزاز میں اعلیٰ سطح پر ادبی محفلوں کا انتظام کیا جاتا تھا۔ جن میں فیض احمد فیض قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، گوپی چند نارنگ، قرۃ العین حیدر، کشور ناہید، زاہدہ حنا، وزیر آغا، راجندر سنگھ بیدی، انتظار حسین، عارف وقار حبیب جالب، عطاء الحق قاسمی، منور حسین، امجد اسلام امجد، صدیقہ بیگم، محمود ہاشمی دہلوی، فاخر حسین، شاہد ملک اور حیات احمد خان، برطانیہ میں رہائش پذیر دانشوروں میں الطاف گوہر، مشتاق احمد یوسفی، محمود ہاشمی، مقصود الٰہی شیخ، امین مغل، رالف رسل سید معین الدین شاہ رضا علی عابدی، ضیاء الدین شکیب، عبداللہ حسین مزوار حسین زیدی، ضیاء محی الدین، انور خالد اور ضیا سرحدی، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ محفلیں زیادہ تر لندن یونیورسٹی نیوزی لینڈ ہاؤس یا اردو مرکز کی عمارت میں ہوتی تھیں، تمام ممبران کو باقاعدہ دعوت نامے بھیجے جاتے تھے۔ اردو ادب میں دلچسپی رکھنے والے مختلف رنگ و نسل اور مذاہب کے لوگ جوق در جوق آتے تھے۔

اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے قلم کار بھی افتخار عارف کے پاس آتے رہتے تھے جن سے ہم فیضیاب ہوئے۔ لندن یورپ کے دوسرے شہروں کے مقابلہ میں صدیوں سے ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں کی جتنی کتابیں اور لائبریریاں یہاں ہیں۔ ملک کی آبادی اور

تناسب کے لحاظ سے شاید ہی کسی دوسرے یورپین شہر میں ہوں۔ تاریخی شہر ہونے کے علاوہ پیرس اپنے حسن اور فیشن کے لئے اور لندن ادب، ڈرامہ اور تھیٹر کے لئے انفرادی حیثیت رکھتا ہے

مجھے ڈرامہ اور اداکاری سے لگاؤ اپنے والد اور چچا کی طرف سے ملا۔ لندن اکیڈمی آف میوزک اینڈ ڈرامیٹک آرٹس سے باقاعدہ تربیت حاصل کی۔ مگر زندگی کی بنیادی ضرورتوں نے الجھائے رکھا، اس لئے اسے اپنا ذریعہ اظہار بنانے کا صحیح موقع نہیں ملا لیکن اپنے کاروبار کے متعلق لکھنا بے سود نہ تھا .... گرم راکھ کے نیچے چنگاری موجود تھی۔ ایک مرتبہ پھر طبیعت لکھنے کی طرف مائل ہوئی۔ رفتہ رفتہ لاشعوری طور پر کچھ واقعات ذہن میں ابھرنے لگے .... ماضی کو ٹٹولا تو کچھ دلچسپ کرداروں سے کہانیاں بننے لگیں۔ جب لکھنا شروع کیا تو اس میں ایک خاص دلچسپی پیدا ہوئی۔ ادبی ذوق رکھنے والے دوستوں اور کچھ مہربان ادیبوں اور شعراء سے ان کی رائے لی۔ ادبی محفلوں میں کہانیاں تنقید کے لئے پیش کیں۔ ہندوستان، پاکستان کے رسائل اور روزنامہ جنگ لندن میں شائع ہوئیں۔

میں نے دیانت داری سے ان کہانیوں کو بلاتعصب لکھا ہے۔ اور اپنے خیال کے مطابق کرداروں سے انصاف کیا ہے اگر قاری کسی لحاظ سے بھی انہیں دلچسپ پائے یا اشاروں کنایوں میں کوئی ان کہی بات پسند آئے تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔

جمشید مرزا
یکم جنوری 1988

244 بال مورل ڈرائیو
ہیز، مڈل سیکس۔ لندن

نور جہاں

1857ء کے وسط کی بات ہے۔ ایک تین چار سالہ لڑکی اپنے ارد گرد اور اپنے گھر والوں سے بے خبر درخت کی ٹہنی اور ایک مینڈک سے کھیل رہی تھی۔ جب چھڑی ذرا سا اس کے قریب لیجاتی، وہ اچھلتا، کودتا اور طرح طرح کے تماشے اسی طرح کرتی ہوئی وہ اپنے سب گھر والوں سے پندرہ بیس گز کے فاصلہ پر ایک طرف کو نکل گئی۔ لمبی گھاس اور پودوں میں دوسرے لوگوں سے اوجھل ہوگئی۔ خاندان کے زیادہ تر لوگ کچھ دور گاؤں کے کچے پکے مکانوں کے پیچھے جا چکے تھے۔ عورتوں کا گروپ پیچھے رہ گیا تھا۔ چند عورتیں کھیتوں میں چلی گئی تھیں خاندان کے زیادہ تر مرد گھوڑوں پر نزدیک ہی کسی بستی سے کچھ کھانے پینے وغیرہ اور دوسری ضروریات کی اشیاء لینے چلے گئے تھے۔ چند نوجوان ہی پیچھے رہ گئے تھے۔ دو تین بوڑھی عورتیں ابھی بھی رتھوں میں بیٹھی ہوئی تھیں ۔۔۔ اچانک ایک دو نوجوانوں نے چلا کر فرنگیوں اور فوج کے آنے کی اطلاع دی اور کچھ افراد فوراً ایک دو مکانوں کے پیچھے چلے گئے۔ بعض عورتیں کھیت کے اونچے پودوں میں گھس گئیں اس بچی کو جو مینڈک سے کھیل رہی تھی سمجھ نہیں آیا کہ اچانک سب کدھر گئے۔ وہ اسے ایک طرح کا کھیل سمجھی ۔۔۔۔ اگر وہ اس وقت یہ سمجھتی کہ کوئی خطرہ کی بات ہے تو شاید رونے لگتی اور کوئی بڑا اسے بھی لپک کر اپنے ساتھ لیجا کر چھپاتا ۔۔۔ نہ وہ کسی کو نظر آئی نہ اس بھاگ دوڑ میں کسی کو یاد رہا کہ وہ کہاں ہے ۔۔۔ ہر کوئی یہی سوچ رہا تھا کہ فلاں کے ساتھ ہوگی ۔۔۔ مگر رونے یا بھاگ دوڑ کے بجائے وہ ایک دو درخت کے پیچھے کھڑی رہی چند لمحوں بعد وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی ۔۔۔ یہ جاننے کے لئے کہ سب کہاں گئے ۔۔ اچانک چاروں طرف خاموشی ہوگئی ۔۔۔ دور تک کسی پرندے یا انسان کی آواز نہ تھی۔ کبھی کبھی ہلکی ہوا سے درخت کے پتوں میں سرسراہٹ ہوتی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو مینڈک ایک گڑھے میں چلا گیا تھا جہاں بارش کا پانی تھا۔

دور سے گھوڑوں کے پھر پھرانے کی آوازیں آئیں۔ تو اس نے کھیتوں کے ساتھ ساتھ گولائی

میں مڑتی ہوئی سڑک کی طرف دیکھا۔ تو خاصے فاصلے پر ایک فوجی دستہ آرہا تھا۔ اسے صحت مند گھوڑوں کو دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ ان گھوڑوں کی ٹاپوں اور ہنہنانے کی آواز بڑھتی جارہی تھی اور قریب آرہے تھے۔ چار گھڑسوار آگے۔ ان کے پیچھے ایک فرنگی سپہ سالار جو اپنی سرخ وردی اور سنہری بڑی مونچھوں کے ساتھ بڑا رعب دار معلوم ہورہا تھا۔ اس کے بعد دو اور فرنگی تھے۔ پھر تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر ہندستانی گھڑسوار تھے۔ تعداد چالیس پچاس کے لگ بھگ تھی وہ ان سے ڈر کر بھاگنے کے بجائے ان کو دیکھنے کے لئے سڑک کے اور قریب آگئی۔ اس نے کپڑے کا ہیٹ پہنا ہوا تھا۔ جس سے آنکھوں اور پیشانی پر چھجا سا بنا ہوا تھا۔ اسی رنگ سے ملتا جلتا فراک بھی تھا۔ چمڑے کے جوتے گھٹنوں تک کے جس پر مٹی اور کیچڑ لگا ہوا تھا۔

جنگ آزادی غداروں کی مدد سے کچل دی گئی تھی۔ اب بہت سے لوگوں کو پکڑ دھکڑ کر کے ناحق بھی پریشان کیا جارہا تھا۔ خاص طور پر جنہوں نے فرنگیوں کی حمایت میں لڑنے یا ان کے لئے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ سنگی بیگ اور ان کا خاندان دلی دربار میں کئی پشتوں سے خدمت انجام دے چکا تھا۔ پنجاب میں ایک راجہ نے ان کو پناہ دی اور اپنے اصطبل اور دوسری ٹرانسپورٹ کا انچارج بنادیا۔ سنگی بیگ نے کچھ عرصہ بعد تمام خاندان کو بھی وہیں۔ آجانے کے لئے پیغام بھیجا۔ گو کہ شاہی خاندان کے وفاداروں کی گرفتاریاں اور قید و بند کا سلسلہ ابھی بھی جاری تھا اور مشکوک لوگ مارے جارہے تھے۔ راستے بھی محفوظ نہ تھے۔ پھر بھی سنگی بیگ کے خاندان نے دلی سے ہجرت کر جانے کا فیصلہ کیا۔

سنگی بیگ کے چھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹی ماں کی طرح گوری چٹی گول چہرہ اور بڑی بڑی آنکھیں رکھتی تھی۔ اس لئے ماں باپ نے نام نور جہاں رکھا۔

نور جہاں نے بڑے گھرانے اور شان و شوکت کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ لیکن قتل وغارت، غلامی، آزادی فسادات، جذبات کی باتیں اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ اس کا معصوم ذہن ڈر اور خون خرابوں سے بھی آشنا نہ تھا۔ بھولی بھالی ننھی نور جہاں خطرے اور دوست دشمن کے فرق کو جانے بغیر تتلی کی طرح اپنی ہلکی پھلکی پرواز سے سڑک کے قریب آکر بڑی معصومیت سے اپنی چھڑی اٹھائے گھوڑوں اور سواروں کو آتے دیکھنے لگی۔

فوجی افسر کا گھوڑا آہستہ آہستہ رک گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے گھوڑے بھی اس کے ہاتھ کھڑا کرنے پر رک گئے۔ فوجی دستے کے سپہ سالار نے گھوڑے کو ذرا آگے بڑھایا۔

اب وہ نور جہاں کے بالکل قریب تھا۔ اس نے گھوڑے کو خوش ہو کر دیکھا اور سیاہ گھوڑے پر سوار سرخ وردی اور دھات کی چمکتی ہوئی ٹوپی میں فرنگی افسر نے سنجیدگی سے اس بچی کو نیچے سے اوپر تک بغور دیکھا۔ جو بلا خوف اب اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نور جہاں نے معصومیت اور تعجب سے گردن کو ذرا ٹیڑھا کر کے دیکھا .... افسر نے اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھا اور گھوڑے کو اس معصوم اور ننھی سی جان کی طرف ذرا اور آگے بڑھایا .... تمام گھڑسوار سکتے میں تھے ... اس بڑے افسر کے پیچھے دو نوجوان فرنگی افسروں میں سے ایک فوراً بولا "سر" ... جیسے کہ وہ اپنے افسر کو کسی خطرناک کام کرنے سے روکنا چاہ رہا ہو ... سپہ سالار نے اپنے ماتحت افسر کی آواز کو نذر انداز کرتے ہوئے۔ اپنی چمکتی ہوئی تلوار کو باہر نکالا۔ "زن" کی آواز سے درخت کے اوپر بیٹھے ہوئے پرندے اڑے ... سپہ سالار تلوار کو اپنے چہرے تک لے گیا۔ یہ ایک اعزازی فوجی سلام کا طریقہ تھا۔ نور جہاں ایک دو قدم پیچھے ہٹی اور تعجب سے دیکھنے لگی۔ فرنگی سپہ سالار تلوار سے نور جہاں کو فوجی سلام کرنے کے بعد مسکرایا اور اپنی تلوار میان میں ڈال لی ... باقی فوجیوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

سپہ سالار نے گھوڑے کو سڑک کی طرف موڑا۔ اپنے ہاتھ کے اشارے سے فوجی دستے کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ گھوڑے اپنی ٹاپوں کا شور سمیٹتے ہوئے دور نکل گئے۔ ادھر گاؤں میں سب لوگوں نے فوجیوں کے جانے پر شکر ادا کیا اور ان کی جان میں جان آئی۔

معصوم خطرے سے بے بہرہ نور جہاں ایک پگڈنڈی پر چلتی ہوئی اپنے خاندان کے لوگوں میں جا ملی۔ چند ایک نے اسے ڈانٹا کہ وہ کہاں تھی ... ایک خاتون نے اسے محفوظ دیکھ کر گلے سے لگا کر پیار کیا۔

.... لیکن یہ بات کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی کہ تھوڑی دیر پہلے۔ فوجی دستہ کس طرح نور جہاں کو سلامی دے کر گیا ہے ...

ہم آپ کو بھولے نہیں

اتنی کھلی سڑک پر زیادہ ٹریفک تو نہ تھی مگر اندھیرے میں تیزی سے آتی ہوئی گاڑیوں سے

بچاؤ۔ کے لئے میں نے اپنا ہاتھ آپ کی طرف بڑھایا، تو آپ نے بھی آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ کتنی اپنائیت تھی آپ کے اس رویے میں ...... کتنا اچھا لگا ہمیں ...... آپ نے ہم پر کتنا احسان کیا ...... ایسا لگا جیسے زندگی میں پہلی بار کسی کو ہم پر ترس آیا ہو ...... زندگی میں پہلی ہی بار میں اس خوف سے آزاد بھی تھا کہ میرا غم کوئی دوسرا نہ جان لے۔ غیروں کو غم کھانے سے فائدہ ...... غیروں کی ہمدردی اور ترس کھانے میں ایک طنز ہوتا ہے۔

آپ تو غیر نہیں۔ آپ کی رگوں میں تو میرا خون دوڑ رہا ہے۔ اگر میرے غم کا پتہ چل گیا تو کیا ہوا ...... مجھ پر ترس آیا تو آپ کا دل بھی اندر سے رو دیا ہوگا۔

میرا ہاتھ تو کئی مرتبہ جھٹک دیا گیا تھا۔ اب تو برسوں سے کسی طرف بھی ہاتھ بڑھانا چھوڑ دیا تھا۔ کون اپنا کون پرایا۔ رشتے کیسے بنتے ہیں کیسے ٹوٹ جاتے ہیں۔ ان جھمیلوں سے باہر رہنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اپنے اندر کی وحشت کو کم کرنے کے لئے کئی طریقے اختیار کئے ...... غیر سنجیدہ لوگوں سے میل ملاپ کیا مطالعہ کیا کچھ لکھا کچھ پڑھا۔ مذہبی رکھ رکھاؤ بھی پورے کئے مگر اندر کی ویرانہ گئی۔ سوچتا تھا شاید میرے حصے کی خوشیاں ہی ختم ہو گئی ہیں۔

اب آپ نے جو میرا ہاتھ پکڑا ...... تو شہاب ثاقب کی طرح اک روشنی سی ہوئی۔ برسوں سے غم میں بھٹکنے والا دل خوشی کے جذبات سے بھر آیا اور آنسو بہہ نکلے۔

سڑک پار کرتے ہوئے جب آپ نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں بے حد پرانی

بات کا خیال آیا، جب ہم فٹ پاتھ پر پہنچ گئے، میں نے آپ سے اس کا ذکر کیا اور بتایا کہ ٹھیک اٹھارہ برس پہلے آپ کی امی اور میں ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے جب اس سڑک سے گزرے تو انہوں نے دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اس وقت آپ بھی ہمارے ساتھ تھیں آپ کے دل کی دھڑکنیں ہم سن سکتے تھے ہم آپ کو، نہ ہی آپ ہمیں دیکھ سکتی تھیں۔ اس کے بعد ہم اپنی مالی پریشانیوں میں اور اپنے ہی لوگوں کے ناروا سلوک کی وجہ سے پیدا ہونے والی نفرت اور اپنے اندرونی کرب کو لئے ہوئے، یورپ روانہ ہو گئے اور آپ میری روانگی کے چار روز بعد پیدا ہوئیں۔

قدرت نے میرے اندر ایسے کل پرزے لگائے تھے، جو مجھے انتقامی کاروائیوں سے باز رکھتے تھے ..... ہو سکتا ہے یہ بزدلی ہو۔ مگر پتہ نہیں کیوں میرا دل ہمیشہ سے اپنے اس رویئے سے مطمئن رہا..... جب بھی کسی نے زیادتی کی ..... خود ذرا سا پیچھے ہٹ گئے مگر یہ ضرور ہے کہ جب اپنوں نے زیادتی کی ..... تو بے حد افسوس ہوا، ایسی صورت میں کچھ عرصہ بعد جب میں انہیں اپنے کئے پر شرمندہ دیکھتا ہوں، تو میں انہیں دل سے معاف کر دیتا ہوں۔

"نفرتوں سے کیا فائدہ ..... نفرتوں میں رکھا ہی کیا ہے "..... یہ سب کچھ آپ بڑی توجہ سے سنتی رہیں۔ جب میں اپنی بات ختم کر چکا..... تو آپ نے دھیمی آواز میں مگر ذرا تیز تیز بولتے ہوئے یہ بات کہی۔

ڈیڈی! جن لوگوں کی فطرت میں کچھ کمزوریاں ہوں ان سے تو نہیں ملنا چاہیے یا کم سے کم احتیاط سے ملنا چاہیے ..... میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا "مجھے خاموش دیکھ کر آپ نے میری رائے پوچھی۔

"نہیں " میں نے کچھ سوچ کر صرف اتنا کہا۔

میں آپ کے ساتھ چلتے چلتے آپ کی بات پر غور کرنے لگا..... جو کہ سطحی نہیں تھی۔

دراصل میں کچھ متعجب ہوا ..... اکثر ماں باپ اپنے بچوں کو ان کی عمر سے کم دیکھتے ہیں۔ آپ کے مستقبل کے متعلق میرا فکرمند ہونا قدرتی بات ہے۔

میری ناقص عقل نے اپنے علم یا ماحول سے، جو بھی سیکھا اور سمجھا ..... اس کی روشنی میں چاہتا تھا کہ آپ سے گفتگو کے دوران زندگی کے مختلف موضوعات پر بات چیت ہو اور آپ ان مسائل پر غور کریں۔

ہم آپ کو بھولے نہیں

اتنی کھلی سڑک پر زیادہ ٹریفک تو نہ تھی مگر اندھیرے میں تیزی سے آتی ہوئی گاڑیوں سے

بچاؤ۔ کے لئے میں نے اپنا ہاتھ آپ کی طرف بڑھایا، تو آپ نے بھی آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ کتنی اپنائیت تھی آپ کے اس رویے میں ۔۔۔ کتنا اچھا لگا ہمیں ۔۔۔ آپ نے ہم پر کتنا احسان کیا ۔۔۔ ایسا لگا جیسے زندگی میں پہلی بار کسی کو ہم پر ترس آیا ہو۔۔۔۔ زندگی میں پہلی ہی بار میں اس خوف سے آزاد بھی تھا کہ میرا غم کوئی دوسرا نہ جان لے۔ غیروں کو غم کھانے سے فائدہ ۔۔۔ غیروں کی ہمدردی اور ترس کھانے میں ایک طنز ہوتا ہے۔

آپ تو غیر نہیں۔ آپ کی رگوں میں تو میرا خون دوڑ رہا ہے۔ اگر میرے غم کا پتہ چل گیا تو کیا ہوا ۔۔۔ مجھ پر ترس آیا تو آپ کا دل بھی اندر سے رویا ہو گا۔

میرا ہاتھ تو کئی مرتبہ جھٹک دیا گیا تھا۔ اب تو برسوں سے کسی طرف بھی ہاتھ بڑھانا چھوڑ دیا تھا۔ کون اپنا کون پرایا۔ رشتے کیسے بنتے ہیں کیسے ٹوٹ جاتے ہیں۔ ان جھمیلوں سے باہر رہنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اپنے اندر کی وحشت کو کم کرنے کے لئے کئی طریقے اختیار کئے ۔۔۔ غیر سنجیدہ لوگوں سے میل ملاپ کیا مطالعہ کیا کچھ لکھا کچھ پڑھا۔ مذہبی رکھ رکھاؤ بھی پورے کئے مگر اندر کی ویرانہ گئی۔ سوچتا تھا شاید میرے حصے کی خوشیاں ہی ختم ہو گئی ہیں۔

اب آپ نے جو میرا ہاتھ پکڑا ۔۔۔۔ تو شہاب ثاقب کی طرح اک روشنی سی ہوئی۔ برسوں سے غم میں بھٹکنے والا دل خوشی کے جذبات سے بھر آیا اور آنسو بہہ نکلے۔

سڑک پار کرتے ہوئے جب آپ نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں بے حد پرانی

بات کا خیال آیا، جب ہم فٹ پاتھ پر پہنچ گئے۔ میں نے آپ سے اس کا ذکر کیا اور بتایا کہ ٹھیک اٹھارہ برس پہلے آپ کی امی اور میں ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے جب اس سڑک سے گزرے تو انہوں نے دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اس وقت آپ بھی ہمارے ساتھ تھیں آپ کے دل کی دھڑکنیں ہم سن سکتے تھے ہم آپ کو، نہ ہی آپ ہمیں دیکھ سکتی تھیں۔ اس کے بعد ہم اپنی مالی پریشانیوں میں اور اپنے ہی لوگوں کے ناروا سلوک کی وجہ سے پیدا ہونے والی نفرت اور اپنے اندرونی کرب کو لئے ہوئے، یورپ روانہ ہو گئے اور آپ میری روانگی کے چار روز بعد پیدا ہوئیں۔

قدرت نے میرے اندر ایسے کل پرزے لگائے تھے جو مجھے انتقامی کاروائیوں سے باز رکھتے تھے ۔۔۔۔ ہو سکتا ہے یہ بزدلی ہو۔ مگر پتہ نہیں کیوں میرا دل ہمیشہ سے اپنے اس رویئے سے مطمئن رہا ۔۔۔ جب بھی کسی نے زیادتی کی ۔۔۔ خود ذرا سا پیچھے ہٹ گئے مگر یہ ضرور ہے کہ جب اپنوں نے زیادتی کی ۔۔۔۔ تو بے حد افسوس ہوا، ایسی صورت میں کچھ عرصہ بعد جب میں انہیں اپنے کئے پر شرمندہ دیکھتا ہوں، تو میں انہیں دل سے معاف کر دیتا ہوں۔

"نفرتوں سے کیا فائدہ ۔۔۔ نفرتوں میں رکھا ہی کیا ہے" ۔۔۔۔ یہ سب کچھ آپ بڑی توجہ سے سنتی رہیں۔ جب میں اپنی بات ختم کر چکا ۔۔۔ تو آپ نے دھیمی آواز میں مگر ذرا تیز تیز بولتے ہوئے یہ بات کہی۔

ڈیڈی، جن لوگوں کی فطرت میں کچھ کمزوریاں ہوں ان سے تو نہیں ملنا چاہئے یا کم سے کم احتیاط سے ملنا چاہئے ۔۔۔ میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا" مجھے خاموش دیکھ کر آپ نے میری رائے پوچھی۔

"نہیں" میں نے کچھ سوچ کر صرف اتنا کہا۔

میں آپ کے ساتھ چلتے چلتے آپ کی بات پر غور کرنے لگا۔۔۔۔ جو کہ سطحی نہیں تھی۔

دراصل میں کچھ متعجب ہوا۔۔۔۔۔ اکثر ماں باپ اپنے بچوں کو ان کی عمر سے کم دیکھتے ہیں۔ آپ کے مستقبل کے متعلق میرا فکر مند ہونا قدرتی بات ہے۔

میری ناقص عقل نے اپنے علم یا ماحول سے جو بھی سیکھا اور سمجھا ۔۔۔۔ اس کی روشنی میں چاہتا تھا کہ آپ سے گفتگو کے دوران زندگی کے مختلف موضوعات پر بات چیت ہو اور آپ ان مسائل پر غور کریں۔

اپنی ہی سوچ میں جب میرے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو آپ نے بھی آہستہ سے ہاتھ کھینچ لیا۔ چند لمحات کے بعد میں نے آپ سے کہا "کوئی بات کیجئے"

"کیا بات کروں" آپ نے کہا۔

"کچھ بھی، کوئی دلچسپ یا خوشی کی بات" میں نے کہا۔

"ایسی تو بہت سی ہو سکتی ہیں" آپ نے ذرا شوخی سے اپنے دونوں ہاتھوں کو ہلا کر کہا۔

"چلئے کوئی غم کی بات کیجئے۔ یا ایسی بات جس سے آپ کو بہت دکھ ہوا ہو" میں نے پھر چھیڑا۔

"ایسی باتیں بھی بہت سی ہو سکتی ہیں۔" آپ نے لمبا سانس لے کر کہا

"کسی ایک کا ذکر کیجئے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"یہ کیا کم دکھ کی بات ہے کہ اٹھارہ برس کی ہونے پر پہلی بار میں نے آپ کو دیکھا" آپ نے غصہ سے کہا۔

"اس میں غلطی کس کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"انٹی رضیہ کی اور کس کی، جن کی حماقت اور خود غرضی کی وجہ سے سب جھگڑے پیدا ہوئے اور سب نے ذہنی تکلیف اٹھائی"

"وہ انٹی نہیں وہ تو آپ کی ماں ہیں" میں نے نرمی سے کہا

"جی نہیں، امی وہ ہیں جنہوں نے مجھے پالا اور بے حد محبت کی" آپ نے کہا

"اس طرح تو میں بھی باپ کہلانے کے لائق نہیں" میں نے آپ کے خیالات کو اور کریدا۔

"خیر!" آپ کی بات اور ہے "...... آپ ناتجربہ کاری کے علاوہ جھگڑوں سے گھبراتے تھے۔ آپ تنہا تھے ..... آپ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی یا پھر سب اس کے اہل نہیں تھے۔"

"چلئے چھوڑیئے اس قصے کو، اپنی کسی بڑی خواہش کا ذکر کریں۔" میں نے موضوع کو بدلا۔

"سب کچھ آپ مجھ سے ہی پوچھے جا رہے ہیں، ..... آپ بتائیے آپ کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے" آپ نے کہا۔

صاف ستھری سڑک پر اب دوبارہ روشنی ہو گئی تھی۔ فٹ پاتھ پر اکا دکا لوگ نظر آ رہے تھے۔ ایک آدھ فیملی بھی چہل قدمی کر رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے جھونکے سے مجھے کچھ خنکی محسوس ہوئی، میں نے الٹے ہاتھ سے آپ کے گال کو چھوا۔ آپ کا چہرہ ٹھنڈا تھا۔ میں نے اپنی جیکٹ اتار کر آپ کے

ڈال دی۔ آپ نے میری اس قربانی پر احتجاج کیا ...... اور کہا "ڈیڈی آپ"

"میں ٹھیک ہوں" میں نے کہا

"آپ اپنا کوٹ پہنے رہتے۔

میں بھی ٹھیک ہوں" آپ نے جھوٹ بولا...... کیونکہ چند لمحات پہلے آپ سردی کی وجہ سے اپنے جسم کو سکیڑ رہی تھیں۔

"ہاں تو میں نے آپ سے کیا پوچھا تھا؟" آپ نے پھر کہا۔

"یہ کہ میری سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟" میں نے یاد دلایا۔

"جی تو بتایئے" آپ نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اپنا دایاں ہاتھ چلتے چلتے آپ کے دائیں کندھے پر رکھ کر کہا

......"بس آپ چار پانچ برس کی ہوں، ایسی ہی ذہانت کی باتیں کریں اور میں آپ کو بھینچ بھینچ کر پیار کروں۔

"اوہ ڈیڈی...... یہ تو بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے کہ میں پھر سے کبھی پانچ برس کی ہوں گی۔ البتہ کسی وقت میری شکل کی شاید "...... یہ کہہ کر آپ شرما گئیں ...... پھر کہنے لگیں" خیر چھوڑیئے کوئی اور خواہش بتایئے"

اور ...... یہ کہ آپ کا ہاتھ پکڑ کر تمام دنیا میں گھوموں ...... میں نے کہا

"ہائے ڈیڈی یہ تو آپ نے میرے دل کی بات کہی ...... مگر تمام دنیا میں گھومنے کے لئے اتنا پیسہ آئے گا کہاں سے"؟ تھوڑے سے وقفہ کے بعد آپ نے پھر کہنا شروع کیا۔ "میری ایک سہیلی کو سیاحت کا بے حد شوق ہے۔ آپ کی باتیں جب وہ مجھ سے سنتی ہے تو کہتی ہے کہ کاش آپ اس کے بھی ڈیڈی ہوتے ایک روز آپ کی تصویر مانگ رہی تھی۔ میں نے پوچھا کیوں، تو کہنے لگی۔

"میں اسے بڑا کر کے بناؤں گی" پھر مجھے یاد آیا کہ وہ تو اچھی خاصی مصور ہے۔

"اس کے اپنے ڈیڈی کو کیا ہوا۔ ان کی تصویر بنائیں میں نے کہا۔

ڈیڈی وہ اتنی پیاری اور ذہین لڑکی ہے۔ کہ کلاس کی ہر لڑکی اور ٹیچرز اس کو اپنی دوست بنانا چاہتی ہیں۔ مگر جب اس کی کہانی اور حالات سن لیتی ہیں تو اس سے اس طرح دور بھاگتی ہیں جیسے کہ

وہ کوئی بھوت پریت ہو۔شروع شروع میں ہر کسی کو وہ اپنا ہمدرد سمجھ کر اپنی سب کہانی سنا دیتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ دو تین سال کی تھی تو اس کے والد سمیت خاندان کے چودہ افراد مارے گئے۔ یہ سب کچھ خاندانی جھگڑوں پر ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصل غلطی بیوقوفی، یا کمزوری اس کی ماں کی ہے۔ جب یہ کہانی سن کر لوگ اس کی ماں کو برا بھلا کہتے ہیں اور سب سے زیادہ ذمہ دار ٹھہراتے ہیں تو وہ برا مان جاتی ہے اور اس شخص کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیتی ہے مگر جب میں نے اس کی بات سنی، اس کی ماں کی بد قسمتی پر افسوس کیا اور ہمدردی ظاہر کی تو وہ مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور کہنے لگی "میری ماں کسی ماں سے کم نہیں" اس وقت سے لے کر وہ آج تک میری گہری دوست ہے۔ ہم دونوں پر لڑکیاں رشک کرتی ہیں ...... ہم کسی قسم کی تنگ دل، تعصب اور غرور کرنے والیوں پر ہنستی ہیں۔ اور ہمیشہ خوشگوار موڈ میں رہتی ہیں۔ نہ ہی کبھی ہمارے ذہن پر کسی قسم کا بیہودہ عشق سوار ہوا ہے۔

"ایک شہزادے جو ہمارے پڑوس میں ہی رہتے ہیں، بچپن سے ہمارے گھر تشریف لا رہے ہیں۔ ایک روز مذاق میں میرے جسم پر بدتمیزی سے ہاتھ مارا تو میں نے ایک زوردار چانٹا رسید کیا" پھر ہنستے ہوئے آپ نے مجھ سے پوچھا "کیوں ڈیڈی ٹھیک کیا؟"

میں نے بھی مسکرا کر کہا.... جی بہت مناسب

چند لمحوں کے بعد میں نے کہا "ہر نوجوان لڑکے لڑکی کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ انجانے میں یا جان بوجھ کر کسی حساس دل کو اپنے پاؤں تلے نہ روندیں دل بے حد نازک چیز ہے کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آس پڑوس میں یا خاندان میں کسی لڑکا لڑکی کو انس ہو جاتا ہے وہ بہت سی باتوں میں ایک دوسرے کے لئے موزوں بھی ہوتے ہیں۔ مگر اصل ٹریجڈی یہ ہوتی ہے کہ لڑکیاں جلد جوان اور لڑکے دیر سے برسر روزگار ہوتے ہیں نتیجہ یہ کہ ایسی قابل قدر محبت آنسوؤں پر ختم ہوتی ہے۔

اسی لئے چند روز پہلے میں اپنے بھتیجے کو کھانے کی میز پر سوالات کر کے یہی نکتہ سمجھانا چاہ رہا تھا۔ اس وقت آپ بھی ان سوالات کو بڑے غور سے سن رہی تھیں۔

آپ نے کچھ مسخرہ پن سے آنکھیں بڑی کر کے کہا "اچھا" اور اچھا کو کچھ لمبا کر کے کہا۔

میں آپ کی اس شوخی سے بہت محظوظ ہوا.... بعد میں آپ نے میرے کمرے میں آ کر کہا

"ڈیڈی آپ کچھ غلط نہ سمجھئے .... مجھے اس سے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ میری اتنی فکر کرتے ہیں۔" جب ہم واپس گھر کے قریب پہنچ گئے۔ آپ نے جیکٹ اتار کر میرے کندھوں پر ڈالتے ہوئے کہا۔ تھینک یو ڈیڈی ..... اور مسکرا کر کالر کو ذرا ٹھیک کیا۔

تھینکس ..... میں نے بھی آہستہ سے کہا..... اور دائیں بازو سے آپ کو اپنے قریب کر لیا۔

آپ نے بھی اپنا سر فوراً ایک لمحہ کے لئے میرے کندھے کے ساتھ لگا دیا

آپ نے اچانک ایک سوال کر دیا......... "ڈیڈی آپ کا اور انٹی رضیہ (ماں) کا کیا جھگڑا تھا۔ یہ شادی کیوں ختم ہوئی"

میں نے بلا تامل کہا "میرا خیال ہے کہ ہم دو مختلف لوگ تھے اور یہ کہ محبت اور نفرت کے علاوہ تیسری چیز ہمیں معلوم نہیں تھی۔ زیادہ خرابی یہ ہوئی کہ کچھ لوگوں نے اسے ذاتی انا کا مسئلہ بنالیا۔ دوسروں کی مداخلت سے حالات اور بگڑ گئے اس توڑ پھوڑ میں ہماری زندگی پر جو اثرات ہوئے اس کی ذمہ داری کسی ایک شخص کے سر تھوپ دیں تو یہ زیادتی ہوگی۔ البتہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس کا نقصان سب سے زیادہ آپ کو اور مجھے ہی ہوا آپ کا مجھ سے پیار اور میری آپ سے بے پناہ محبت اس کا ثبوت ہے۔

دوسرے روز ائیر پورٹ پر جب آپ سب لوگوں کے ساتھ مجھے چھوڑنے کے لئے آئیں تو آپ کچھ اداس نظر آئیں۔ میں نے آپ کو ہنسانا چاہا..... آپ نہ ہنسیں۔

میں نے کچھ خوشگوار باتیں کر کے آپ کے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی ..... آپ اور اداس ہو گئیں مجھے آپ سے چند ماہ کی جدائی کا خیال آیا تو میرا دل بھی ڈوبنے لگا۔

اچانک! معلوم نہیں آپ کو کیا خیال آیا۔ آپ نے دونوں ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا " ڈیڈی مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو یا آپ کو میری کوئی بات غیر مناسب لگی ہو تو معاف کر دیجئے گا اور وہاں جا کر ایک طویل خط لکھئیے ..... تاکہ پتہ چلے کہ آپ ہمیں بھول نہیں گئے۔"

آج آپ کو خط لکھنے لگا تو میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا لکھوں اسلئے زیادہ تر باتیں وہی لکھ دی ہیں۔ جو روانگی سے ایک روز پہلے آپ کے اور میرے درمیان ہوئیں۔ آپ نے بے حد خوبصورت باتیں

کہیں۔ مجھے آپ پر بڑا فخر ہے لیکن کسی وقت اپنی سہیلی کی سوچ پر غور کیجئے۔ گو کہ یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن میں آپ کی جگہ پر ہوں تو وہی کہوں جو آپ کی سہیلی نے اپنی ماں کے متعلق کہا۔۔۔ اور کیا لکھوں۔۔۔۔ دیکھ لیجئے ہم آپ کو بھولے نہیں۔

ہائیڈ پارک

اشتیاق صاحب کو ریٹائر ہوئے چھ ہفتے ہی ہوئے تھے کہ طرح طرح کی بیماریوں نے آگھیرا۔ حالاں کہ اپنی سروس کے دوران کیسے چاق و چوبند رہتے تھے۔ ان کے دوسرے کولیگ ان کی صحت پر رشک کرتے تھے۔ صحت سے یہ مراد بھی نہیں کہ ان کے گال سرخ تھے یا کراٹے کے داؤ میں کسی کی ٹانگ توڑ سکتے۔ یا آنکھیں دکھا کر اپنی بات منوالیتے۔ ایسی کوئی بات نہ تھی وہ نہایت پتلے دبلے سانولے رنگ اور بڑی عمدہ قسم کی شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے کام میں بڑے ماہر اور دیانت دار، وقت کی پابندی سے دفتر جانا اور آنا۔ انہیں چھٹیوں کی بھی پرواہ نہیں ہوتی تھی اسی وجہ سے ریٹائر منٹ پر فنڈ وغیرہ کافی ملا۔ سب بچے بڑے ہو چکے تھے اور ان کی شادیاں بھی ہو چکی تھیں۔ شروع شروع میں اشتیاق ایسے لوگوں سے بہت متاثر ہوتے۔ اور دل ہی دل میں ایڈ مائر کرتے اور کہتے کیا صحت ہے۔ گالوں پر گوشت ہو اور سرخی ہو تو انسان کیا خوبصورت اور رعب دار لگتا ہے۔ تھوڑی سی ٹانگیں چوڑی کر کے چلنے میں جو ایک میوزک ہے وہ پتلے دبلے آدمی کی چال میں نہیں۔ جیسے لکڑی کا پسلا فرش پر پھسلتا ہوا جارہا ہے۔ مگر جلد ہی انہیں اندازہ ہوا۔ کہ موٹاپا صحت نہیں ان پر بیماریوں کا حملہ جلد ہوتا ہے۔ اس طرح کے لوگوں کی آدھی تنخواہ ٹیشو پیپر اسپرین اور دوسری دوائیں خریدنے میں چلی جاتی ہیں۔

مگر اب جو ریٹائر ہوئے تو کبھی آدھے سر میں درد کبھی کمر یا ٹانگوں میں درد آج سر چکرا رہا ہے تو کل سانس پھولنے لگا اور ناک بند ہو رہی ہے۔ صبح اٹھیں تو سینے میں اور ایک بازو میں درد اس کے علاوہ بہت سی ایسی تکالیف جو ڈاکٹر کو بھی بتانا مناسب معلوم ہوتی تھیں بلکہ بعض اوقات

تو مختلف وجوہات کی بنا پر ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں جانا چاہتے تھے۔ کچھ تو شرم کی وجہ سے کہ جسم کا یہ حصہ دکھاؤ وہ دکھاؤ کا چکر، دوسرے اس ڈر سے کہ کہیں ڈاکٹر کینسر یا اس طرح کی کوئی خطرناک بیماری کی خبر نہ سنائے اور کہے کہ اب چل چلاؤ کے دن ہیں اور چند ماہ یا ایک دو سال باقی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

چند روز تو اسے وہم سمجھ کر ٹالتے رہے۔ شیشے میں کھڑے ہو کر دیکھتے اور اپنے آپ سے کہتے بڑھاپا ہے۔ آہستہ آہستہ تبدیلی تو آنی ہی ہے۔ اب سر کے بالوں کو مجھے کیا کرنا ہے۔ کنگھے کم خریدنے پڑیں گے۔ اور شیمپو بھی کم خرچ ہو گا۔ پیٹ تھوڑا سا بڑھنا شروع ہو گیا ہے۔ کھانا کم کر دوں گا۔ دونوں بازو اوپر نیچے ہلائے .... ٹھیک ٹھاک تھے۔ شاید کرسی کے ساتھ کمر لگا کر نہیں بیٹھتا رہا اس لئے کمر میں درد ہے اور اسکے لئے ادرک کا حلوہ ٹھیک رہے گا۔ حلوہ بنانے لگے تو اچانک بیگم باورچی خانہ میں آگئیں اور انکوائری کی ...... "اچھا اس کا یہ فائدہ ہے" ؟.... بیگم نے کہا۔

اس طرح کا علاج سن کر انہیں بھی اس بیماری کی شکایت ہوگئی ...... دو چار روز ادرک کا حلوہ بنتا رہا۔ "گاجر کا حلوہ آنکھوں کے لئے مفید ہے"۔ اشتیاق نے کہا "اچھا .... تو پھر کسی روز یہ بنائیں"۔ بیگم نے کہا۔

اشتیاق نے یہ سب علاج آزما لیے تو خاص تبدیلی نہ آئی۔

ایک روز کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر سڑک کی طرف دیکھنے لگے تو ایک بوڑھا انگریز سردی میں بھی ایک بڑھیا کو وہیل چیئر پر لیے جا رہا تھا انہیں دیکھ کر دل ہی دل میں ان کی ہمت کی داد دی۔ ان کے اندر بھی ایک ولولہ سا پیدا ہوا ...... اور سوچا .... انسان کو اپنے جسم میں حرکت رکھنی چاہیے۔ بڑھاپے میں جسم کے جس حصے کو استعمال نہ کریں وہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اگر چلوں پھروں گا نہیں تو ٹانگیں کمزور ہو جائیں گی انہوں نے کپڑے بدلے گلے میں مفلر لپیٹا سر پر پی کیپ رکھی اور باہر نکلے۔

ان کی بیگم کام سے آرہی تھیں ..... گاڑی سے نکلیں "میں چھوڑ آؤں؟ کہاں جا رہے ہیں؟" بیگم نے کہا۔

"نہیں .... میں پیدل ہی جانا چاہتا ہوں ... ایک گھنٹہ تک آیا" اشتیاق صاحب نے جواب دیا۔ چند قدم جا کر پھر لوٹ آئے۔ واپس آکر کہنے لگے "دراصل جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ اکثر مجھے کوئی نہ کوئی ساری تکلیف رہتی ہے۔ اب اس تفصیل میں کیا جاؤں ہر طرح کے حلوے اور سالن

میں طرح طرح کے مصالحے آزما کر دیکھ لیے ہیں مگر کچھ افاقہ نہیں "۔ بیگم کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر کہنے لگے۔

نہیں نہیں ۔۔۔ اس میں ہنسنے کی بات نہیں ہے ۔۔۔۔۔ ان کا فائدہ ہوتا ضرور ہے۔ ورنہ ہمارے آباؤاجداد کوئی پاگل تو نہیں تھے۔ کیسی کیسی عمدہ قسم کی بریانی حلوے اور مرنوں کا استعمال کرتے تھے تو ان کی صحت بھی کیسی تھی۔ یہ انگریز لوگ تو کھوکھلے ہوتے ہیں آلو اور مٹر کے پلے ہوئے۔

ہاں! ایک دو بات ان کی صحیح ہیں میں اگنور بنٹ نہیں ہوں۔ یہ کہ ٹھنڈا ملک ہے ۔۔۔ اس میں مچھلی تیتر اور بٹیر کا استعمال ضروری ہے اور سردی گرمی تازہ ہوا میں باہر گھومنا چاہئے اور ورزش کرنا چاہئے ۔۔۔۔ اب یہ تیتر بٹیر والی بات تو آپ بھول جائیے۔ کیونکہ حلال تیتر بٹیر تو نایاب ہیں۔ البتہ باہر نکل کر گھومنے کی بات اپنے ہاتھ میں ہے۔

اچھا اب جائیے ۔۔۔ دیر ہو رہی ہے اندھیرا ہونے والا ہے۔ ان کی بیگم نے کہا۔

اشتیاق صاحب جاتے جاتے پھر واپس آ گئے ۔۔۔ سنیئے ۔۔۔ میرے آنے تک ایک دو شامی کباب تل کر رکھیے اور گرم دودھ ۔ گھر میں بادام تو ہوں گے زیادہ نہیں تو سات آٹھ بادام پیس کر دودھ میں ڈال دیجئے۔

اچھا اچھا ۔۔۔۔ ڈال دوں گی "۔ بیگم نے جل کر کہا اور جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

اشتیاق صاحب پانچ دس قدم سینہ تان کر چلے ۔ مگر جلد ہی سردی کی وجہ سے گردن اندر کو کرلی "۔۔۔۔۔۔ اور مفلر اچھی طرح لپیٹ لیا۔ کچھ ہوا لگی تو اس بوڑھا بوڑھی کو کوسنے لگے۔ جو اس ہوا میں باہر نکلے تھے ۔۔۔۔ انگریز بوڑھا اگر بڑھیا کو سیر کے لئے یا ڈاکٹر کے پاس ہی لے جا رہا تھا تو کم سے کم چیک کر لیتا کہ باہر ہوا ہے یا نہیں۔ یا موسم کی خبریں ہی دیکھ لیتا۔ اب ان کو دیکھ کر میں باہر آ گیا اشتیاق نے سوچا۔۔۔۔ اصل میں میری بھی غلطی ہے۔ کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر دیکھنا ہی نہ چاہئے تھا۔ اب ٹانگوں کو بھی سردی لگ رہی تھی۔ انہوں نے ٹھوڑی اور آدھا چہرہ مفلر کے اندر کر لیا تھا۔ کندھے کسی گدھ کی طرح اونچے کر لیے تھے سڑک کراس کرتے وقت ادھر ادھر گردن گھمانے میں بھی تکلف برت رہے تھے صرف ایک آنکھ سے ٹریفک کو دیکھتے تھے۔ زیبرا کراسنگ پر یہ چیک کئے بغیر کہ آتی ہوئی ٹریفک کے ڈرائیور نے انہیں دیکھ بھی لیا ہے یا نہیں ۔۔۔۔ اس پر چلنے لگے

چار پانچ گاڑیوں نے بریکیں لگائیں ..... تو دائیں طرف کے ڈرائیور کو سر سے سلام کر کے اپنے دونوں ہاتھ اپنے اوور کوٹ کی جیب میں ڈالے ہوئے کچھ اچھلے اور زیبرا کو کراس کر گئے انہیں انڈر گراؤنڈ ٹرین سے ہائیڈ پارک جانا تھا ٹکٹ کے لئے لائن لمبی تھی چند لمحے کچھ سوچا مگر پھر لائن میں کھڑے ہو گئے۔ اشتیاق اندازہ لگانے لگے کہ اس لائن کو ختم ہونے میں کتنی دیر لگے گی۔ پھر لائن سے باہر نکل آئے۔ اور گھر کی طرف چلدیئے ... اپنے طریقے سے زیبرا کراس کرنے لگے .... زیبرا کراس کے درمیان میں خیال آیا ..... کہ ابھی دودھ اور بادام وغیرہ تیار نہیں ہوئے ہوں گے تو پھر واپس اسٹیشن کی طرف پلٹے ..... گاڑیوں والوں نے انہیں ہارن. بجا. بجا کر ڈانٹا۔ اشتیاق صاحب کو اس کی کوئی پرواہ نہ تھی ..... بد تمیز ..... اندر ہی اندر بڑبڑائے ..... بلکہ ایسی انگریزی گالیاں جو انہوں نے کبھی کسی کو نہیں دی تھیں ان کے دماغ میں اچھلنے لگیں۔

ٹرین کا ٹکٹ لینے کے لئے پھر لائن میں جا کھڑے ہوئے ...... اتفاق سے دوسری کھڑکی کھلی۔ تو لائن کم ہو گئی اور جلد ہی ٹرین کا ٹکٹ مل گیا۔ اسکیلیٹر پر نیچے اترے ...... پھر بغیر عینک کے، آنکھیں چندھیا کر ٹیوب کا نقشہ پڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ کچھ یاد آیا تو گھبرائے گھبرائے پلیٹ فارم پر پہنچے ..... ٹرین میں داخل ہوئے تو کافی رش تھا .... جلد جلد سیٹ ڈھونڈنے لگے۔ ایک سیٹ خالی دیکھی تو اس طرف لپکے ..... مگر ایک خاتون جو سیٹ کے نزدیک ہی تھیں، اس پر بیٹھ گئیں۔ اس سے انہیں خفت ہوئی۔ ایک دو نے مسکرا کر ان کے زخم پر نمک چھڑکا .... دھنا دھن ..... دھنا دھن ...... کھٹا کھٹ ...... ٹرین تیزی سے جا رہی تھی۔ کھڑے ہوئے لوگ ہینڈلز پکڑے جھول رہے تھے ...... اشتیاق سوچنے لگے۔ بچپن میں کرسی والے کھیل میں اگر کچھ پریکٹس کی ہوتی تو اس وقت ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔... واپس آکر کونے میں کھڑا ہونا چاہا۔ اب وہ کونا بھی خالی نہ تھا۔ پاؤں کچلے جانے کے ڈر سے یا اس خیال سے کہ کہیں کسی خاتون پر نہ گر پڑیں وہ ایک کونے میں دبک جانا چاہتے تھے۔

اچانک ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی، دروازے کھلے .... تو ایک دم لوگ اندر آئے ..... رش بڑھ گیا ...... ایک خاتون بالکل ان کے سامنے آگئیں۔ اب اتنے لوگ اندر آگئے تھے کہ ہلنا بھی مشکل تھا۔

اشتیاق صاحب نے گردن کچھ نیچے کو جھکالی تاکہ ان کا سانس اس خاتون کے چہرے پر نہ پڑے مگر اب اس خاتون کا سانس ان کی گردن میں جار ہا تھا ...... ایک دو اسٹیشن کے بعد رش کم ہوگیا...... ایک سیٹ انہیں پھر خالی نظر آئی۔ مگر ایک گٹارسٹ اس طرف سے آرہا تھا جو لوگوں کو محظوظ کرنے کے معاوضے میں والینٹری پیسے بھی قبول کرتا تھا۔ اس کے اس طرف آنے کی وجہ سے راستہ بلاک ہوگیا۔ اتنی دیر میں ایک اور شخص اس خالی سیٹ پر بیٹھ گیا ...... اشتیاق صاحب بڑی حسرت سے اسے دیکھتے رہے۔ اس طرح سیٹ کا دوسرا چانس بھی چلا گیا۔ گٹارسٹ ان کے پاس ہی آکر کھڑا ہوگیا اور زور زور سے گٹار بجا کر گانے لگا۔ اشتیاق صاحب کو اس قدر اونچا میوزک سننے کی عادت تو نہ تھی۔ مگر پھر بھی مسکرا مسکرا کر اس کی داد دیتے رہے۔ اس پر گٹارسٹ نے اور اونچی آواز میں گٹار بجائی اور گانا شروع کر دیا۔ ان کی انگلیاں دس پنس کے سکے سے کھیلتی رہیں جو ان کی جیب میں تھا۔ اشتیاق گانے کے آخر میں اسے دینا چاہتے تھے۔ ایک انگریز لڑکا اگلے اسٹیشن پر اترنے والا تھا۔ اسٹیشن آنے سے پہلے اپنی سیٹ سے کھڑا ہوگیا اور اخلاقاً اشتیاق صاحب کو اس سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا ...... اشتیاق صاحب نے مسکرا کر اس لڑکے کا شکریہ ادا کیا اور اس سیٹ کی طرف نہ گئے۔ اگلا اسٹیشن ہائیڈ پارک کارنر کا تھا ...... دھن دھن ...... دھن دھن ...... غالباً اسٹیشن قریب ہی تھا ...... اشتیاق صاحب سوچ رہے تھے کہ دس پنس اس سفید فام ...... گٹارسٹ کو دیں یا نہ دیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ایشین سے پیسے لینا پسند نہ کرے۔ دھڑل کی آواز سے دروازے کھلے۔

اشتیاق نیچے اترے ...... اسکیلیٹر پر قدم رکھا ...... آہستہ آہستہ اوپر چلے گئے۔ سڑک کراس کر کے پارک میں داخل ہوئے مغرب کا وقت ہوگیا تھا۔ پارک میں کم لوگ نظر آئے ...... ایک آدھ بینچ پر بیٹھا تھا۔

دور ...... دور ایک ایک یا دو تین اکٹھے جوگنگ کر رہے تھے۔

اشتیاق نے دو تین لمبے لمبے سانس لے کر آہستہ آہستہ سانس چھوڑا۔ "اس طرح اگر بیگم ہفتے میں دو چار مرتبہ یہاں آئیں۔ تو ان کی عمر بھی دو چار سال بڑھ جائے" اشتیاق نے سوچا۔

نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنی شارٹس یا جاگنگ سوٹ میں دوڑتے ہوئے پاس سے گزرے

...۔ تو اشتیاق نے ان کو تعریف کی نگاہ سے دیکھا ......۔ دل ہی دل میں یورپین اقوام کی اچھی باتوں کا سوچنے لگے ......۔ دو خاتون پاس سے گذریں جو اس سردی میں بھی اکڑ کر چل رہی تھیں۔ اشتیاق صاحب نے سردی سے بچنے کے لئے دونوں کندھے اٹھا رکھے تھے۔ پاس سے گذرتے ہوئے ایک خاتون جب اشتیاق کی طرف دیکھ کر مسکرائی تو وہ اکڑا کڑ کر چلنے لگے مگر جلد ہی گردن اندر کرلی اور کندھے آہستہ آہستہ پھر اپنی جگہ چلے گئے۔

تھوڑی دیر ادھر ادھر گھوم کر پھول اور پودوں کو تعریفی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ پھر جھیل کی طرف سے کشتیوں، بطخوں اور سی گلز کو دیکھتے ہوئے گزرے ان کی انگلیاں ایک مرتبہ پھر جیب میں پڑے ہوئے سکے سے کھیلنے لگیں۔

ایک بنچ پر ایک بے گھر شرابی لیٹا ہوا تھا......۔ پاس ہی ایک دو بیئر کے ڈبے پڑے ہوئے تھے۔

اشتیاق نے دوڑ لگانے کا ارادہ کیا ...۔ اپنا اوور کوٹ اتار کر گھاس پر ڈال دیا اور مفلر گلے میں اچھی طرح لپیٹ لیا۔ دونوں ہاتھوں کو رگڑا ...۔ ایک دو بار اچھل کود کی ہی تھی کہ پیچھے سے سرسراہٹ کی آواز آئی اور ایک بڑے کتے نے زور سے دھکا دیا ...۔ اور اوپر سے گزر گیا ...۔ اشتیاق حواس باختہ ہو کر گرے

کتا بجلی کی سی تیزی سے پھر پلٹ کر آیا مگر اس سے پہلے کہ وہ ان تک پہنچتا ایک نوجوان لڑکی نے دوڑ کر اس کتے کو ڈانٹا اور اس کا پٹہ پکڑ کر اس میں زنجیر ڈال دی۔

اشتیاق کچھ نروس اور غصے میں چند سیکنڈ کھڑے رہے ...۔ پھر کچھ دیر ہاتھوں کو شیک کر کے ورزش کرنے لگے۔ جب ان کے دل کی حالت کچھ ٹھیک ہوئی اور دور دور کوئی کتا نظر نہ آیا ......۔ تو دوڑتے دوڑتے کچھ دور گئے۔ سانس جب زیادہ پھولنے لگا تو چہرہ آسمان کی طرف کر کے آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ ایک لمحہ کے لئے رکے پھر اپنے کوٹ کی طرف آنے لگے۔ جہاں انھوں نے اپنا کوٹ گھاس پر رکھا تھا۔

وہاں دیکھا تو کوٹ نہیں تھا ......۔ کچھ فاصلہ پر ایسا لگا جیسے وہی شرابی ان کا کوٹ لئے جا رہا تھا ......۔ وہ بنچ بھی خالی تھا۔ جہاں شرابی لیٹا ہوا تھا۔

اشتیاق اس آدمی کی طرف دوڑے۔ جو کچھ فاصلے پر جا رہا تھا ......۔ اس شرابی نے جب ان کو

اس کی طرف دوڑتے دیکھا تو بھاگ نکلا۔۔۔ اشتیاق بھی پیچھے بھاگے۔ ایک پولیس والے نے جب اشتیاق کو شرابی کی طرف بھاگتے دیکھا۔ تو وہ ان کے پیچھے پیچھے بھاگا ۔۔۔۔ دوڑتے دوڑتے جب اشتیاق نے پولیس والے کو بتایا کہ وہ میرا کوٹ لے کر جارہا ہے۔ تو پولیس والا اشتیاق کو چھوڑ کر شرابی کی طرف بھاگا۔

شرابی نے کوٹ پھینک دیا اور خود بھاگتا رہا ۔۔۔۔۔ دوڑتے دوڑتے پولیس والے کی ٹوپی گر پڑی ۔۔۔۔۔ پولیس والے نے اپنی ٹوپی اٹھائی کوٹ اٹھایا تو شرابی کچھ دور نکل گیا۔ پارک کے کچھ لوگ اور گیٹ کے پاس کھڑے ہوئے یہ تماشہ دیکھنے لگے۔

پولیس والا اپنی لمبی ٹانگوں سے پھلانگتا ہوا جارہا تھا اور اس کا کوٹ ہوا میں لہرارہا تھا ۔۔۔۔ پہلے شرابی پھر پولیس والا درختوں میں گم ہوگیا۔۔۔۔ اشتیاق صاحب کا سانس پھول گیا تو آہستہ آہستہ چلنے لگے۔

شرابی اندھیرے میں کہیں ادھر ادھر ہوگیا۔

پولیس والے نے اشتیاق سے آکر سب ماجرا پوچھا ۔۔۔۔ پھر ان کی عمر پوچھی اور ان کا کوٹ ان کے حوالے کیا۔

پھر کہا کہ "پیسے وغیرہ چیک کرو یاد یکھو کہ کوئی چیز تمہارے کوٹ سے غائب تو نہیں ہوگئی۔"

اشتیاق نے پہلے کہا نہیں ۔۔۔۔ پھر کہاں ہاں ۔۔۔۔ صرف دس پنس"

پولیس والے نے کہا کہ مجھے یقین ہے۔ کہ دس پنس کے لئے تم پولیس اسٹیشن جاکر اس کی رپورٹ کرنا پسند نہیں کروگے۔

اشتیاق نے کہا ہو سکتا ہے کہ دس پنس بھی یہیں پر گھاس میں گر پڑے ہوں۔

"ہو سکتا ہے" پولیس والے نے بھی کہا۔ پھر کہنے لگا کہ اگر میں تمہاری جگہ ہوں تو تمہاری عمر میں اس وقت اور یہاں پر جاگنگ کرنے نہ آؤں ۔۔۔۔ پھر پوچھنے لگا کہ کہاں سے آئے ہو (اس سے اس کی مراد تھی کہ لندن کے کس علاقے سے آئے ہو)

اشتیاق نے کہا ۔۔۔۔ "کراچی سے" ۔۔۔۔ پولیس والے نے ہنس کر کہا۔ جاگنگ کرتے ہوئے بہت دور نکل آئے ہو۔

اشتیاق جب پولیس والے کے سوال کو سمجھ گئے تو وہ بھی ہنسنے لگے۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے پارک سے باہر نکل آئے۔ اشتیاق ٹیوب اسٹیشن کی طرف مڑے ۔۔۔۔ تو پولیس والے نے بائے بائے کہا۔۔۔ اشتیاق نے بھی جواب میں ہاتھ ہلایا اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد اشتیاق نے جاگنگ تو چھوڑ دی مگر جب موسم خشک ہوتا تو اپنی بیگم کے ساتھ لمبی واک کے لئے ہائیڈ پارک آتے ۔کبھی کبھی اسپیکرز کارنر پر کھڑے ہو کر تقاریر سنتے۔

لپ اسٹک سے اہم فیصلہ تک

موسیقی کی ہلکی پھلکی دھن میں اس نے لپ اسٹک لگے ہونٹ میرے کان کے پاس لاکر پوچھا۔"کیا تم تھکے ہوئے ہو؟"

"نہیں" میں نے کہا

"آج تم کوئی بات نہیں کررہے" اس نے پھر پوچھا۔

میں نے ہاں ہوں کے درمیان کوئی آواز نکالی۔ اپنے اطراف کے رنگین اور خوشگوار ماحول کے باوجود، میں اپنے ہی خیالوں میں گم تھا اور وہاں موجود نہ تھا۔ میری حالت اس وقت ایسے بچے کی سی تھی، جو کسی میلے کے کھیل تماشوں کے درمیان بھی اداس، کھویا کھویا سا، پریشان اور فکر مند ہو کہ کہیں اس جھمیلے میں گم نہ ہو جائے ...... اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ڈانس میں چکر لگاتے ہوئے میں نے اسے تھوڑا سا اپنی طرف جھکایا اور چہرے پر سرسری نگاہ ڈالی ..... پھر آنکھوں میں دیکھا..... تو اس کی ہلکی نیلی آنکھوں میں ڈانس ہال میں لگی ہوئی روشنیوں کا عکس نظر آرہا تھا۔

"تم کتنی اچھی لگ رہی ہو" میں نے اپنی زبان میں آہستہ سے کہا

"کچھ سنائی نہیں دے رہا" اس نے اور قریب ہو کر کہا۔

"چند لوگوں کی توجہ ڈانس میں نہیں ہے" پرنسپل چلایا۔

میں ذرا سا ڈانس میں لڑکھڑایا ...... میری ڈانس پارٹنر نے بڑے اعتماد سے مجھے سنبھالا ..... وہ ایک اچھی شکل وصورت کی چھبیس ستائیس سالہ نہایت متوازن جسم کی عورت تھی

اونچی ایڑی پہن کر میرے برابر ہی لگتی تھی۔ ابھرے ہوئے سینہ کی وجہ سے میں اسے اپنے ذہن میں وینس کے نام سے ہی یاد رکھتا تھا۔ ایک مہربان مسکراہٹ ہر وقت اس کے چہرے پر ناچتی رہتی تھی مجھے دیکھتے ہی وہ ہنس دیتی میں بلاتامل اس کو اپنا ڈانس پارٹنر بننے کی درخواست کرتا وہ ہمیشہ خوشی سے میرا ہاتھ پکڑ کر فرش کے درمیان آجاتی ہے۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ وہ ڈانس ٹیچر ہے اور ویک اینڈ پر بچوں کو بال روم ڈانس سکھاتی ہے۔

پہلے روز جب ڈانسنگ اسکول کے پرنسپل نے وہاں کے طور طریقے سمجھاتے ہوئے کہا" کہ یہاں تم سب لوگ ڈانس سیکھنے کے لئے آتے ہو۔"

"کوئی عشق بگھارنے نہیں آتے اس لئے خوش دلی سے جو بھی سامنے آئے ڈانس پارٹنر کی حیثیت سے اس کے ساتھ فرش پر آجاؤ۔ اگر کچھ حضرات اپنی گرل فرینڈ یا بیوی کے ساتھ آئے ہوں تو ان لوگوں کو فراخدل ہونا چاہیے۔ ہر مرتبہ اپنی گرل فرینڈ یا بیوی کے ساتھ ہی ڈانس کرنا ضروری نہ سمجھیں۔"

چند سیکنڈ خاموشی کے بعد ایک مرد ٹیچر نے میوزک کے ساتھ دو چار قدم خود کر کے دکھائے پھر ایک لڑکی کو بلا کر اس کے ساتھ وہی قدم دہرائے اس کے بعد مرد اور عورت کے جوڑے ایک ساتھ کھڑے ہو گئے۔ تقریباً چالیس پچاس مرد عورتوں کی اس کلاس میں سولہ سال کی عمر سے لے ستر برس کی عمر کے مرد اور عورتیں شامل تھیں۔ ایک گھنٹہ کے بعد جب وقفہ ہوا تو میں نے ایک کولڈ ڈرنک لی اور ایسی جگہ جا کر بیٹھا، جہاں پہلے سے کوئی اور نہیں بیٹھا تھا، تنہائی کے احساس کو دور کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ کبھی کھڑکیوں پر پڑے ہوئے پردوں کو دیکھتا کبھی کاونٹر پر سروس کرتے ہوئے لڑکے لڑکیوں کو دیکھتا کسی وقت میرے پاس سے گزرتے ہوئے کسی شخص کی نگاہ مجھ سے ملتی تو وہ مغربی مسکراہٹ دے کر گزر جاتا مگر کوئی بھی میرے قریب آکر نہ بیٹھا خود جا کر کسی گروپ میں بیٹھنے یا کسی سے بات کرنے کی ہمت نہ تھی۔

اچانک ایک بوڑھا انگریز نمودار ہوا ..... اور میری طرف چلتا ہوا آیا یہ اپنے ڈارک سوٹ میں بڑا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ میری میز کے پاس ہی ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا کہ " اس کرسی پر کوئی اور تو نہیں بیٹھا ہوا۔"

"جی نہیں، آپ بیٹھ سکتے ہیں" میں نے نرمی سے کہا۔ وہ مسکرایا اور اپنی ڈرنک میز پر رکھتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "شاید تم یہاں نئے ہو؟ اس نے پوچھا" جی ہاں" کہتے ہوئے میں نے اس کی طرف بڑی احسان مندی سے دیکھا میں خوش تھا کہ بڑے میاں سے کچھ گفتگو رہے گی مگر وہ اپنی ڈرنک پیتے ہوئے ادھر ادھر گھومتے پھرتے لوگوں کو دیکھنے لگا اور میں اس کا سر سے پاؤں تک بغور جائزہ لینے لگا۔

انگریز بزرگ کے سر کے بال سفید اور نفاست سے کٹے ہوئے تھے اس کا سرخ و سپید چہرہ چمکتی ہوئی آنکھیں اور چھریرا بدن اس کی عمدہ صحت کا ثبوت تھا پاس سے بڑی بڑی آنکھوں اور گول چہرے والی ایک دراز قد لڑکی گزری، تو مسکراہٹ کے ساتھ بوڑھے انگریز کی طرف منہ سا چڑا کر چلی گئی۔ اس انگریز نے بھی آنکھ مار کر اس کی دوستی کا جواب دیا۔

"اچھی لڑکی ہے" اس نے کہا ...... "اکثر میرے ہی ساتھ ڈانس کرنا چاہتی ہے۔ شاید میں اچھا ڈانس کرتا ہوں اس لیے" اس نے پھر کہا

میں نے اس کی ڈرنک کی طرف دیکھا جو ختم ہونے کو تھی۔

"کیا میں آپ کے لئے ڈرنک خرید کر لا سکتا ہوں" ؟ میں نے انگریز بزرگ سے پوچھا۔

" اگر تم چاہو، شکریہ" اس نے فوراً کہا۔

میں نے کاؤنٹر سے اس کی پسند کی ڈرنک لا کر سامنے رکھی۔ تو اس نے کہا۔ "آئندہ میں تمہارے لئے خریدوں گا" میں نے مسکرا کر آہستہ سے گردن ہلادی۔ اس طرح اس پر یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ مغربی طور طریقوں سے بخوبی واقف ہوں۔

انگریز بزرگ نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اس علاقے کے ڈانس ہال پورے برطانیہ میں مشہور ہیں۔ لوگ لندن اور برطانیہ کے دوسرے شہروں سے اکثر یہاں آتے ہیں، ایک دو ڈانس ہال ایسے بھی ہیں۔ جہاں بدمعاش مرد اور عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔"

بدمعاش! میں نے ذرا وضاحت چاہی۔

بوڑھے انگریز کے چہرے پر حقارت کے تاثرات تھے ...... کچھ دیر خاموشی کے بعد کہنے لگا ...... "یہ دراصل ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی جنسی ہوس پوری نہیں ہوتی ...... حالاں کہ وہ

شادی شدہ ہوتے ہیں " یہ سن کر مجھے دھچکا سا لگا اور سوچنے لگا۔۔ شاید یہ سب کچھ طنزیہ کہہ رہا ہے اور صاف کہنے سے کترا رہا ہے ۔۔۔ مگر اسے کیا معلوم کہ میں شادی شدہ ہوں یا نہیں ہوں ۔۔۔۔ ہو سکتا ہے میری بھلائی کے لئے یہاں کی اونچ نیچ سے آگاہ کرنا چاہتا ہو؟

ممکن ہے اس نے جو کہا ۔۔۔۔ اتفاقیہ ہو؟ اس کا اس سے کچھ مطلب ہی نہ ہو۔۔۔۔ اس کی باتیں سوچ کر میرا گلا خشک ہونے لگا۔ میں بچے ہوئے کوک سے اپنا حلق تر کرنے لگا۔

بوڑھا انگریز معاف کیجئے کہتے ہوئے جنٹس کی طرف چلا گیا اور مجھے کئی الجھنوں میں ڈال گیا ۔۔۔۔۔۔ پھر میں وطن میں کچھ خوبصورت لمحات کا سوچ کر مغموم سا ہو گیا۔

اچانک ڈانس ہال کی طرف سے کسی کے چلانے کی آواز آئی ۔ غالباً ٹیچر سب کو بلا رہا تھا۔ ٹیچر نے اٹھارہ انیس برس کی ایک لڑکی کو میری طرف دھکیل دیا اور کہا یہ نیا پرندہ تمہارے لیے ہے۔ لڑکی نے تعجب کے اظہار میں ٹیچر کے اس مذاق پر بھنویں چڑھائیں تو میں نے مغربی مسکراہٹ سے خوش آمدید کہنے کی کوشش کی میں اب تک نظر انداز کیے جانے کے احساس سے نادم سا کھڑا تھا۔ مگر اب سکون کا سانس لیا اس طرح ایک اجنبی لڑکی کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑ کر اتنا قریب کھڑے ہونے سے میرا جسم گھبراہٹ اور شرم سے کپکپا رہا تھا اس لڑکی نے کچھ تعجب سے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا ۔۔۔۔۔ پھر مزید مسکراہٹ سے مجھے تسلی دی۔ ایک خاتون نے مرد ٹیچر کے اشارے پر ریکارڈ پلیئر کو چلایا۔ تو تیز موسیقی شروع ہوئی ۔۔۔۔۔ ٹیچر کی آواز کے ساتھ ساتھ سب لوگ لکڑی کے چکنے فرش پر قدم ملا کر ڈانس کرنے لگے جب ٹیچر ایک دو تین چار، گنتی کرتا تو سب لوگ اپنے قدم بڑی احتیاط سے ادھر ادھر رکھتے جس سے ایک خوشگوار سا شور پیدا ہوتا۔

پھر اچانک موسیقی بند ہو جاتی اور ٹیچر کسی کی غلطیاں بتاتا۔ کبھی کبھی ٹیچر میرے آہستہ اور ڈھیلے پن کی نقل اتار کر دوسروں کے لئے تفریح مہیا کرتا۔۔۔۔ میں بھی ہنس دیتا اور اس پر متعصب ہونے کا شک نہ کرتا۔ آہستہ آہستہ میرا حجاب دور ہو تا گیا۔ دوسروں سے گھل مل جانے کے طریقے سمجھ میں آتے گئے ۔ وینس سے جان پہچان آگے بڑھی تو ماحول کی گھٹن اور بھی ختم ہو گئی ۔ ہر ہفتہ ڈانسنگ اسکول وقت پر پہنچتا، رنگ برنگی روشنیوں کے بھنور میں موسیقی سے مسرور ہو کر گھومتا اور زندگی کی لطافتوں کو چھوتا ہوا محسوس کرتا۔ ایک آدھ ڈانس کے علاوہ وینس اکثر

میری ڈانس پارٹنر ہوتی۔ اس کی مدد سے اچھا خاصا بال روم ڈانس سیکھ لیا بدھ کی شام اچھی گزر جاتی جس کا مجھے پورا ہفتہ انتظار رہتا تھا موسیقی سے مجھے خاص رغبت تھی اس جگہ کا ماحول صاف ستھرا اور محفوظ بھی تھا۔

مگر وینس کے ہمدردانہ رویئے سے کبھی کبھی گھر کی اتنی شدید یاد آتی کہ میرا ذہن ہزاروں میل دور پہنچ جاتا اور سب گھر والوں کے چہرے نظروں میں گھوم جاتے۔ اپنا وطن یاد آتا، جہاں مجھ سے محبت کرنے والوں کی تعداد کسی لہلہاتے کھیت کی طرح تھی اور وینس کی محبت اور خلوص ایسا ہی تھا جیسے صحرا میں ایک چھوٹا سا پودا وینس کے اندر کسی وقت میں اپنی بہن کبھی ماں کا دل دیکھتا۔ جنسی تعلق سے کہیں زیادہ میرا دل محبت کے لئے بے چین تھا۔ بعض اوقات میری روحانی محبت گڈمڈ ہو جاتی، میرا دل چاہتا میں اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دوں اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر خوب آنسو بہاؤں، کام سے واپس آ کر رات کو اردو گانے سننا کافی نہ تھا یہ تو اور بھی غمزدہ کر دیتے تھے۔

گھر والوں کو خطوط لکھنے سے وقتی طور پر کچھ تسکین ہو جاتی تھی مگر جب میرے خطوں کے لمبے چوڑے جواب آتے تو یہ پیار بھرے مسودے کئی کئی روز کے لئے مجھے اداس کر دیتے ڈانس سکول ہی واحد ایسی جگہ تھی جہاں میں اپنی پریشانیاں بھول جاتا۔

ڈانس پارٹنر بدلتے رہتے مگر وینس کی بات ہی اور تھی اس کے طور طریقے رکھ رکھاؤ خوش مزاجی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے ساتھ میں خود کو بڑا محفوظ اور باعزت محسوس کرتا تھا۔

ایک روز بہت سوچ بچار کے بعد میں نے ایک اہم فیصلہ کیا۔ ڈانس اسکول پہنچ کر میں وینس کے ساتھ علیحدگی میں بات کرنے کے لئے بے چین تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد جب وقفہ ہوا تو ہم ڈرنک لے کر ایک طرف جا کر بیٹھ گئے ...... میں نے دو تین بار بات کرنا چاہی ....

مگر وینس اپنی دوستوں کے کچھ قصے مجھے سنائے جا رہی تھی .... آخر مجھے کہنا پڑا .... پلیز .... خاموش ہو جاؤ وہ تعجب سے میرے منہ کو تکنے لگی .... میں نے اس سے شادی کی خواہش ظاہر کی .... تو وہ خاموشی سے اپنا ڈرنک پینے لگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے لپٹ کر فوراً مجھے پیار کرنے لگے گی .... مگر میں اسے خاموش دیکھ کر بہت متعجب ہوا .... پھر آہستہ سے پوچھا .... کیا تم شادی شدہ ہو؟ اس نے "نہیں" کے لئے گردن ہلائی۔ "کیا تم مجھے پسند نہیں کرتیں؟" میں نے پوچھا

"پسند" اس نے تلخ ہنسی کے ساتھ کہا۔ پھر کہنے لگی۔ "تم پسند کی بات کرتے ہو..... میں تم سے بے حد محبت کرتی ہوں ..... مگر مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ تمہیں کس طرح بتاؤں ..... ڈر ہے کہ تم برا مان جاؤ گے "..... اس نے کہا۔ یقین کرو تم جو بھی کہو میں اس کا برا نہیں مناؤنگا" میں نے کہا

کہنے لگی۔ "ہمارے بچوں کے لئے مشکلات پیدا ہوں گی" ..... ابھی انسان اتنا مہذب اور فراخدل نہیں ہوا "....

میں نے جب اس پر غور کیا تو تعصب کے بے شمار تانے بانے نظر آئے۔ ہم کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور اٹھ کر چلی گئی۔

دیکھیں پاپا!

نو ماہ کا عرصہ کوئی ایسا زیادہ تو نہ تھا۔ لیکن پھر بھی تم مجھ سے بڑے تو تھے۔ کھیل کود میں تم ہی رہنمائی کرتے جو بھی کھیل تم کھیلتے، میں سادگی سے تمہارے ساتھ ہو لیتا۔ میں شرماتا تھا تم بے باک اور بے تکلف تھے میں خطروں سے ڈرتا اور ہچکچاتا تم لڑکوں کے بڑے گروپ میں بھی اپنے نڈر ہونے کا ثبوت دے دیتے۔ گہرے پانی میں ہمیشہ تم سب سے پہلے چھلانگ لگاتے۔ بھڑوں کے چھتے کو تم پہلے چھیڑتے، اونچے اور مشکل درخت پر تم چڑھ جاتے، دوسرے سوچتے رہ جاتے۔۔۔۔ لڑکوں میں تم ہر دلعزیز بھی تھے۔ تم جلد ہی دوستی کر لیتے تم میں امیر، غریب، چھوٹے بڑے کا اور مذہبی تعصب نہ تھا گلی محلے اور اسکول کے سب بچے تمہیں جانتے تھے تم جس کے گھر چاہتے بلا خوف و خطر اور بے دھڑک چلے جاتے جن میں غیر مذہب کے لوگ بھی تھے کسی بھی لڑکے کے ماں باپ کو تمہاری دوستی پر اعتراض نہ تھا۔

۔۔۔۔ ان دنوں تمہاری عمر ہی کیا تھی گیارہ بارہ کے لگ بھگ ہوگی میں تھوڑا سا چھوٹا تو تھا ہی لیکن تم ویسے بھی مجھ سے ذرا صحت مند تھے اور زندگی سے بھرپور تھے۔ میں تمہیں تعجب سے دیکھتا اور تمہاری طرح ہوشیار، لڑکوں میں مقبول اور بے تکلف ہونا چاہتا تھا۔ تمہارے زیادہ دوست اور وسیع جان پہچان کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چند سال میں نے مدرسہ میں پڑھا اور تم شروع ہی سے سرکاری اسکول میں جا رہے تھے۔ جہاں غیر : ب کے لڑکے بھی تھے تم مذاق کا جواب دے سکتے تھے اور بات کو ٹال بھی سکتے تھے میں گھبرا جاتا غصے میں لی ہوئی بات بے معنی ہو جاتی۔ میں رو پڑتا

یالڑاسی لئے میرے دوست محدود تھے۔ جو صرف میرے طریقے سے مجھے ملتے۔ شیخی خوروں، باتونی اور منہ پھٹ لوگوں سے ڈرتا تھا۔ تمہارے ساتھ میں ہمیشہ خوش رہتا اور ساتھ ہی چہکار ہتا تم نہ ہوتے تو میں اکیلا اکیلا محسوس کرتا۔ کسی کھیل میں مزانہ آتا ایک بات اور بھی تھی تم بڑے بھائی کی طرح سے میرا خیال رکھتے اور میں تمہاری موجودگی میں اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتا۔ گو کہ رشتے کے بھائی اور بھی تھے مگر ہم ایک ہی ماحول میں اکٹھے پلے اور بڑھے۔ تم جیسے باہر سے نظر آتے تھے ویسے ہی اندر سے بھی تھے۔ تمہاری ہر ادا قدرتی تھی۔ کسی سے نفرت، انتقام، طنز اور طعنہ کا نام ونشان نہ تھا تم کسی پر شک نہ کرتے۔ کئی مرتبہ میں ڈر جاتا اور سوچتا کہ کہیں بڑے لڑکوں سے دوستی لگا کر تم نقصان نہ اٹھاؤ ...... مگر تم پر کوئی آنچ نہ آئی۔

...... تمہیں جیتنے کا بھی شوق تھا مگر یہ سب شغل کے طور پر نہ کہ مجھے پریشان کرنے کے لئے تمہیں ایسے ہی ذرا سا چڑانے میں مزا آتا تھا۔ ماہ رمضان میں تم مجھ سے ایک آدھ روزہ زیادہ رکھ لیتے اور مجھے نہ بتلاتے، پھر عید کے روز تم ہنستے اور خوش ہوتے کہ زیادہ روزے رکھ کر تم مجھ سے جیت گئے ہو۔

...... کیونکہ دونوں ایک ہی خاندان اور ماحول میں پرورش پا رہے تھے اس لئے کردار کی اہمیت اور اچھائی برائی کی اونچ نیچ کو سمجھتے تو دونوں ہی تھے مگر دونوں کی طبیعت مختلف تھی۔ تم بے تکلفی اور صاف گوئی میں محفوظ محسوس کرتے میں احتیاط اور ڈر کی چادر لپیٹے رکھتا وقت گزرتا گیا۔ ہم دونوں لڑکپن سے جوانی میں داخل ہوئے تو وقت نے کچھ عرصے کے لئے ہمیں علیحدہ کر دیا۔ اس کے بعد مالی پریشانیوں میں تم بھی رہے میں بھی رہا تم اپنی حوصلہ مندی کی وجہ سے عشق ومحبت کے آداب جلدی سیکھ گئے کیونکہ تم ایسے ہی شہری ماحول میں تھے۔ پھر وہی ہوا جس کا مجھے بچپن سے ڈر تھا تمہیں بڑی عمر کے ایسے لڑکے ملے جنہوں نے تمہیں ایک مصیبت میں پھنسا دیا۔ ذاتی طور پر کیونکہ تمہاری کوئی غلطی نہ تھی اس لئے چند بار سوخ رشتہ داروں کی کوشش سے تم پریشانی سے بچ گئے۔ یہی ایک واقعہ تھا جس نے تمہاری زندگی بدل دی۔ تمہیں احساس ہو گیا کہ کھیل کود کا زمانہ ختم ہو گیا ہے ...... اور یہ کہ غلط دوستوں سے الجھاؤ پیدا ہو جاتے ہیں پھر تم یکسر بدل گئے تم نے محنت کی اپنی ذمہ داریوں کو سنبھالا رکاوٹوں کو پھلانگتے گئے۔ مالی حالت سدھرتے ہی خاندان کے باعزت

فربن گئے تم بڑے اسمارٹ تھے۔ تم چلتے تو کھڑکیوں اور چھتوں سے لڑکیاں تمہیں دیکھتیں تم مسکراتے تو رومانس کی بجلیاں گرتیں اور میں تم پر رشک کرتا ان دنوں والدین کی مالی پریشانیوں کی وجہ سے میری زندگی کی تمام قدریں درہم برہم ہورہی تھیں اس طرح کے حالات نے میرے چہرے پر اداسی کی مہر لگادی۔ جوانی بے وقت نازل ہوئی تھی۔ ہر نقصان اور بدقسمتی کا ذمہ دار مجھے ٹھہرایا جاتا اپنے اور غیر سب ہی طنز اور طعنہ کی مہارت دکھارہے تھے۔

۔۔۔ میں پریشان ہوگیا۔۔۔۔ گھبراگیا۔۔۔۔ اسی گھبراہٹ کو ذرا چھپانے کے لئے اپنے اعتماد کو بحال کیا جوانی کا فطری تقاضا بھی تھا۔۔۔۔ نگاہ نیچی نہ رکھ سکا۔۔۔۔ جوابی تیر اتنا تیز تھا کہ مجھے زخمی کرتا ہوا تمہارے قدموں میں جاگرا۔ تم نے اسے چوما اور مسکرا کر اپنے پاس رکھ لیا اگلے روز فخر سے اس کا ذکر کیا میں تمہاری خوشی پر پانی نہیں پھیرنا چاہتا تھا ذہنی تکلیف تو بہت ہوئی کیونکہ یہ میری پہلی محبت تھی مگر میری تم سے محبت بھی کچھ کم نہ تھی۔ میں نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ میں تمہیں کچھ دینے کے قابل ہوگیا ہوں۔ اس قربانی سے میں اک نئی طرح کے غم سے نڈھال ہوگیا لیکن میں نے تمہیں نہیں بتلایا تم خوش ہو کر اس کا بار بار ذکر کرتے، میں اپنی اندرونی حالت کو چھپاتا رہا۔ اس قربانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ طاقتور محسوس کرنے لگا۔ زندگی کے اس موڑ پر میں نے زندگی کو ذرا سنجیدگی سے لینا شروع کیا یہاں صرف میری برادرانہ دوستی کی قربانی کا مسئلہ نہ تھا ہم دونوں کی خاندانی تربیت کا زبردست امتحان بھی تھا۔ مجھے تو معلوم تھا کہ کیا کرنا ہے مگر تمہیں میں خاموشی سے دیکھتا رہا۔ میں نے اسی ڈر سے کچھ نہ کہا کہ کہیں تم یہ نہ سوچو کہ حسد کی بنا پر میں تمہیں مشورے دے رہا ہوں۔ وقت کا تقاضا یہی تھا کہ ایسی بے وقت جذباتی محبت کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ اس غم کی پیمائش کو بھی نظرانداز کردیا جائے کم سے کم اس وقت میں نے یہی سوچا بعد میں معلوم ہوا کہ تم نے بھی خاموشی کو ترجیح دی۔ اس طوفان کو گذر جانے دیا اور اپنا سر جھکادیا۔

اس طرح ہم دونوں نے انکی ساکھ پر کوئی حرف نہیں آنے دیا۔ جس کا بجاطور پر وہ حق رکھتی تھیں جذباتی لگاؤ ایک فطری تقاضا ہے لیکن اپنے اردگرد کے ماحول اور تعلق داروں کی عزت اور احترام بھی تو ضروری تھا۔ اس طرح سے معاشرہ میں اپنا جائز مقام بنائے رکھنے میں مدد ملی۔ میرے لئے جذبات اور عقل میں توازن قائم کرنے کا پہلا موقع تھا۔ اس مقابلہ میں تم نہیں جیت سکے بلکہ برابر رہے۔

..... پھر تمہاری شادی ہوئی تو کس طرح سب رشتہ داروں نے مل کر خوشی منائی۔ رات بھر گانے ہوتے رہے عروسی رات کے بعد تم کس طرح بچوں کی طرح خوش اور اپنی شادی سے مطمئن تھے تم نے اپنی عروسی رات کا وہ حصہ سنایا جو تہذیب کے دائرے میں تھا جس میں دو جوان دلوں کے ملنے کی خوشبو اور تازگی تھی تم نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح ہم سب کے گانوں کی آواز صاف تمہارے کمرے تک پہنچ رہی تھی اور یہ تمہیں کتنا اچھا لگا۔ میں یہ باتیں سن کر ایسے خوش ہوا جیسے کہ یہ میری شادی ہوئی تھی .....

جب سے میں نے ہوش سنبھالا کئی مرتبہ والدہ کو اپنے بھائی یعنی تمہارے والد کے مرنے کا ذکر کرتے سنا وہ اس تکلیف دہ واقعے کا ذکر کچھ ایسے کرتیں جس طرح کہ وہ دنیا کی سب سے قیمتی چیز تھے۔ جو کہ دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے تھے ان کی عمر بیس برس سے بھی کم تھی تم سوا سال اور میں چھ ماہ کا تھا۔ تمہاری شادی کے چند سال بعد میری بھی شادی ہو گئی مگر اس وقت تک ہم ہزاروں میل دور تھے۔ اس فاصلہ سے ہماری محبت میں کوئی کمی نہیں آئی شروع شروع میں اس خیال سے کہ تم غیر ملک میں نہ جا سکے۔ شاید افسوس کرتے ہو گے تو میں غیر ملکوں کی بڑھا چڑھا کر برائی کرتا۔ تم سمجھ جاتے اور مسکرانے لگتے .....

چند سال پہلے تم دین کی طرف راغب ہونے لگے میں اکثر مسلمانوں کے دکھ درد، تعلیم اور پس ماندگی کا ذکر کرتا۔ تم آخرت کی تیاری کی بات کرتے ہم دونوں ہی مسلمانوں کی بہتری کے خواہاں تھے مگر ہماری سوچ اور راستے مختلف تھے ہم دونوں ایک دوسرے کے خیالات کو غور سے سنتے مگر کبھی اس پر تلخ بحث نہ کرتے تم نے داڑھی رکھ لی تو بہت سے رشتہ داروں اور ملنے والوں نے تعجب کا اظہار کیا میں تمہاری غیر موجودگی میں تمہاری حمایت کرتا ایک مرتبہ کسی میزبان نے کھانے کی میز پر چند مہمانوں کی موجودگی میں بلا سوچے سمجھے جس کی وہ اہلیت بھی نہ رکھتا تھا۔ تمہاری مصروفیت پر سخت تنقید کی میرے خون کا دوران تیز ہو گیا۔ قریب ہی تھا کہ میں میز پر چند برتن پٹخ دیتا مگر میرے ذہن میں تمہارے مسکراتے ہوئے چہرے نے میری رہنمائی کی اور غصے میں کوئی بات کہنے یا کرنے سے باز آیا۔

...... لیکن کھانے سے میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا باقی سب لوگ خاموشی سے کھانا کھاتے

رہے داڑھی رکھنے پر اور مذہبی تنظیم میں شامل ہونے پر چند ایک نے مسرت کا اظہار کیا لیکن ان دنوں بعض تمہاری فیملی کے ممبر اس پر مطمئن نہ تھے اور پریشان تھے کیونکہ وقت کا زیادہ حصہ تم گھر سے باہر اور مذہبی تنظیم کے ساتھ گزارتے مگر چند ہی برس گزرے تو تمہارا گھر خوشیوں سے بھر گیا ۔تم اپنی بیٹیوں کی ذمہ داری سے فارغ ہو گئے جن کے متعلق کبھی تم بہت فکر مند تھے۔ خاندان تمہیں بڑے احترام اور بزرگ کی حیثیت سے دیکھنے لگا......

تمہاری ایک بیٹی نے جو شادی شدہ تھی باپ کی محبت کی اعلیٰ مثال قائم کی جس سے میں بے حد متاثر ہوا یہ بیٹی ایک ایسے شہر میں مقیم تھی جہاں سے تمہیں چند روز ٹھہرنے کے بعد غیر ملکی سفر پر روانہ ہونا تھا۔ تمہاری بیٹی نے بتایا کہ "پاپا سفر پر روانہ ہونے سے پہلے مجھے ملنے آئے تو کچھ تھکے ہوئے اور بہت کمزور لگے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر مجھے رونا سا آگیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اتنے تھوڑے عرصے میں ان کے لئے کیا کردوں۔ "میں نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا پاپا میری ایک بات مانیں گے "وہ مسکرائے "میں نے کہا "دیکھیں پاپا اب آپ انکار نہ کریں "کہنے لگے "بتاؤ کیا بات ہے ؟" ......میں نے کہا "آپ لیٹ جائیں "وہ سمجھ گئے اور ہنستے ہوئے ہوئے لیٹ گئے... میں نے خوب ان کا جسم دبایا...وہ خوش ہو کر دعائیں دینے لگے۔ چچا میں نے اتنا اچھا محسوس کیا اور اتنی مجھے خوشی ہوئی آپ کو بتا نہیں سکتی۔ چچا ہم سب بہن بھائی اور تمام فیملی اتنی مزے کی زندگی گزار رہے ہیں شاید یہ سب ان کی دعاؤں سے ہی ہو۔

آج تم اس دنیا میں نہیں ہو۔ زندہ ہوتے تو ریٹائرمنٹ کے بعد ہم دونوں مل کر تمہاری رہنمائی میں انسانیت کے لئے کچھ کام کرتے... معلوم نہیں تمہیں جنت میں جانے کی ایسی کیا جلدی تھی...

اخلاقی دائرے

خاں صاحب سے الوداع ہو کر میں گھاس پر آٹھ دس قدم دوڑا اور ایک چھوٹے پودے کے

اوپر سے پھلانگ کر جھومتا ہوا پارک سے باہر آگیا مجھے اس بات سے بڑی مسرت ہوتی ہے۔ جب کوئی دوست یا ملنے والا مجھے کہتا ہے کہ تم شروع سے ایسے ہی ہو۔ غالباً اس سے ان کی مرادیہ ہوتی ہے کہ میں عادات و خصائل اور اپنے اطوار سے ایسا ہی ہوں۔ جیسا کہ دکھائی دیتا ہوں۔ ایسی ہی کوئی بات خان صاحب نے پارک میں اپنی گفتگو کے آخر میں کہی۔ مجھے اپنے اندر پہلے ہی ایک خاص قسم کی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ کیونکہ ایک روز پہلے ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد مجھے بتایا تھا کہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں، صحت میں کوئی خرابی نہیں جن باتوں کا وہم ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بلڈ پریشر وغیرہ بھی نارمل ہے......

خاں صاحب کی ایک بات جو مجھے پسند ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے کی بات کو بھی غور سے سنتے ہیں ...... مگر کسی وقت تعریف کرنے لگتے ہیں تو میرے اندر ہوا بھر جاتی ہے اس کے متعلق کسی وقت ان سے احتجاج کرنا پڑے گا اچھا یا برا...... جیسا بھی ہوں ...... کسی سازش سے ڈرتا ہوں ...... نہ خود کسی کے خلاف کوئی پلان بناتا ہوں اور نہ ہی کسی کی چاپلوسی کرتا ہوں ...... صاف اور کھرا...... صاف ذہن سے طبیعت بھی ہلکی پھلکی رہتی ہے۔ لوگ ہمیں جلد سمجھ جاتے ہیں کہ ہم کسی کے لئے خطرہ نہیں ہیں زندگی اتنی لمبی کہاں ہے کہ ادھر ادھر الجھتے رہیں...... میں چلتے چلتے سوچ رہا تھا۔

بعض لوگوں کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ...... کہ ادھو!...... اتنی عمر کس تیزی سے گذر گئی ...... یہ تو یادداشت کی بات ہے۔ دیکھا جائے تو ہر دن ایک افسانہ یا ناول کی طرح ہے۔ اگر ہم سوچیں اور یاد رکھیں ...... چاہیں تو پوری زندگی چند سیکنڈ میں اپنے سامنے لے آئیں۔ لیکن اگر کسی خاص وقت

یا لمحات کو ہم نے اچھی طرح محسوس کیا ہو اور غور سے دیکھا ہو تو وہ وقت ہمیں یقیناً طویل دکھائی دے گا۔ گھر پہنچ کر خیال آیا کہ آج شام دعوت پر جانا ہے۔ لیکن پھر بھی ایک گھنٹے سے زائد ایک سائڈ چیئر پر گزار دیا۔ پھر چند منٹ کھڑکی میں کھڑا ہو کر بیک گارڈن کو گھورتا رہا۔

دوسرے کمرے سے بیٹی کی آواز آ رہی تھی۔ شاید ماں سے بات کر رہی تھی شروع میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ بعض لوگ بیٹیوں کی پیدائش پر کیوں گھبراتے ہیں؟..... لڑکا ہو یا لڑکی بس...... دونوں سے محبت پیار مل سکتا ہے دونوں ایک ہی طرح کی ذمہ داریاں ہیں .... مگر اب یہ دیکھا ہے کہ ماں باپ جتنا بھی آزاد خیال ہوں بیٹی کے معاملہ میں زیادہ فکر مند ہوتے ہیں .... اس ذمہ داری کو پورا کرنے کیلئے اس تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں اپنے اور پرائے کی پہچان مشکل ہو گئی ہے۔ صرف ان کے رویوں اور برتاؤ سے اپنے پرائے اور غیر اپنے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ایسے حالات میں صاف ستھرے ذہن میں بھی شکوک کی رسی کنڈلی مار کر بیٹھ جاتی ہے۔ بچوں میں ڈسپلن اور تربیت کی کمی، بڑوں کے اطوار میں ڈھیلا پن قریبی رشتوں میں بھی فاصلوں کو بڑھا دیتا ہے۔

.... اس زمانے میں اپنا وہ ہے جس کا ذہن صاف ہے جسے ماں باپ بہن بھائی کی عزت اور رشتوں کی پہچان ہے۔ اچھائی اور برائی کا مطلب سمجھتے ہیں کردار کی سرحدوں پر نگاہ رکھتے ہیں ..... اس طرح کی باتیں سوچتا ہوا میں پھر سیٹی پر بیٹھ گیا.... سولہ برس کی بیٹی کے ہر عمر کے چہرے اور ازدواجی زندگی کے مختلف لمحات سامنے آنے لگے۔ وہی وقت اور موسم وہی خوشبو وہی احساسات وہی کھانے کا مزہ، مسرت، خوشیاں، چھوٹی موٹی تلخیاں اور وہی پیار و محبت کا جذبہ یہ سب کس طرح انسان کے دل و دماغ میں ریکارڈ ہو جاتے ہیں۔

"ڈیڈی کیا اب آپ پاکستان سے واپس آ گئے ہیں؟" اپنی رونی سی آواز میں چار سالہ بیٹی نے اچانک انگریزی میں یہ سوال کیا جو کہ سلیٹی رنگ کی گرم یونیفارم میں تھی.... میں اسے نزدیک ہی نرسری سکول سے لے کر آ رہا تھا۔

"ہاں اب آ گیا ہوں" میں نے ننھے سے زخمی دل پر پھاہا رکھا "وہ خوشی سے میرے بازو پر لٹک گئی.... ہم دونوں جب اپنی سڑک پر داخل ہوئے تو وہ فٹ پاتھ پر جمی ہوئی برف پر پھسل پھسل کر کھیلتی ہوئی آگے آگے چلنے لگی..... مجھے اس کی بات اور رونے جیسی آواز پر شرمندگی ہوئی اور

ذہنی تکلیف پھر کچھ تعجب ہوا کہ چند ہفتے باپ کے اتنے دور جانے پر چار سال کا بچہ اتنا پریشان ہو سکتا ہے۔ چند ہی لمحہ بعد جب وہ ہنس ہنس کر اسکول کی باتیں کرنے لگی تو میں مطمئن ہو گیا۔

آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے "کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر بیگم نے کہا ۔۔۔

میں سیٹی پر بیٹھا ہوا اپنے خیالات سے واپس آیا۔ چھ بجنے والے ہیں ۔۔ کیا سوچ رہے ہیں" بیگم نے پھر کہا۔

باتھ روم میں گیا ۔۔۔ ٹب پانی کا بھرا ۔۔۔ نہایا ۔۔۔ باہر نکلا تو قمیص، دھلی ہوئی بنیان اور جراب نکال کر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ٹائی کی گرہ کھسکا کر درمیان میں کی ۔۔۔ بالوں کو ہاتھ سے ٹھیک کر کے ذرا شریفانہ بنایا ۔۔ تو نیچے سے آواز آئی "آپ آرہے ہیں بیگم بلا رہی تھیں۔

بیٹی، جسے کچھ دیر پہلے خیالات میں چار سال کی عمر میں سلیٹی رنگ کی یونیفارم میں دیکھ رہا تھا۔ اب وہ سولہ سال کی صحت مند لڑکی تھی اور شلوار قمیض میں اپنا کوٹ پہنے میرے سامنے کھڑی تھی۔

کتنا بدل گئی ہے میں نے دل میں کہا۔

چند ماہ پہلے متعارف ہونے والا جوڑا باہر اپنی کار میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ان کی گاڑی ہمیں لے کر لندن کی سڑکوں پر بھاگنے لگی۔ ماجد صاحب اپنی گاڑی بڑی مہارت سے چلا رہے تھے۔ مگر پھر بھی میری بیگم نے کہا "ذرا آہستہ چلایئے یہ تیز رفتاری سے گھبراتے ہیں۔

"آپ بالکل فکر نہ کیجئے" ماجد صاحب نے کہا ۔۔ میں نے دل میں اطمینان کیا۔ کیونکہ بات کرتے ہوئے انہوں نے میری طرف نہیں دیکھا۔ اور اپنی توجہ سامنے ہی رکھی ماجد صاحب واقعی اچھے ڈرائیور تھے۔ سامنے کی سیٹ پر بیلٹ باندھے میں آرام سے بیٹھا ہوا تھا ہلکی سردی کی وجہ سے سب نے کھڑکیوں کے شیشے چڑھا دیئے۔ میں نے معمولی سا شیشہ کھلا رہنے دیا۔ پچھلی سیٹوں پر ماجد صاحب کی بیگم ان کے ملنے والی ایک خاتون، میری بیگم اور ہماری بیٹی بیٹھی ہوئی تھیں پیچھے بیٹھی ہوئی خواتین کے سر یا کپڑوں سے پرفیوم اور ماجد صاحب کی طرف سے الائچی کی خوشبو آرہی تھی گویا فیملی گروپ کی ویک اینڈ پارٹی کا پہلے ہی احساس ہو رہا تھا میں نے بھی پولو مینٹ منہ میں رکھ لی پیچھے کی سیٹوں پر ۔۔۔ واقعی ۔۔۔ اچھا ۔۔۔ ہاں میں جانتی ہوں ۔۔ "مجھے معلوم ہے ارے ان کی تو بات ہی اور ہے" قسم کی باتیں ہونے لگیں ۔۔۔ کبھی کبھی مہذب قسم کے قہقہے بھی ہوتے رہے۔ "میرے جیون ساتھی خاموش کیوں ہو۔" ماجد صاحب کی بیگم نے اپنے میاں کو چھیڑا۔

"ڈرائیونگ تو ہاتھوں اور پاؤں سے کر رہے ہیں۔۔۔ زبان سے نہیں"۔۔۔ان کی دوست نے لقمہ دیا۔

"آپ لوگ اپنی گفتگو جاری رکھیں، میں سب کچھ سن رہا ہوں" ماجد صاحب نے کہا۔

ماجد صاحب اچھے ڈرائیور ہی نہیں، سمجھدار اور ذمہ دار آدمی بھی تھے۔ میں ماجد صاحب کی ڈرائیونگ سے مطمئن ہو کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا اور پھر اپنے ہی خیالات میں گم ہو گیا۔۔۔ "انسان خود اعتمادی کی وجہ سے بعض اوقات بہت خوش امید رہتا ہے اور سوچتا ہے۔ جیسے بہت سی باتیں اس کے اپنے ہاتھ میں ہیں۔۔۔ مگر ایسا ہے تو نہیں۔۔۔ اچھے برے دن رواں دواں رہتے ہیں، انھی دنوں اچھے اچھے لوگ چلے جاتے ہیں۔۔۔ گلے شکوے اور مسکراہٹیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں دوست واحباب بدلتے رہتے ہیں۔ جسم کی پھرتی اور تیزی کم ہو جاتی ہے۔۔۔ کھانے پینے کا وہ مزا نہیں رہتا ولولے اور جوش ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔۔۔ خواب کم آتے ہیں۔۔۔ امنگیں سرد پڑ جاتی ہیں مگر جب تک زندہ ہیں زندہ تو رہنا ہے۔"

"بیٹی اب سمجھدار ہو رہی ہے۔ اس کا قد بڑھ رہا ہے۔ وہ پڑھائی میں زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔۔۔ اس کی صلاحیتیں، بڑھ رہی ہیں اس میں خود اعتمادی پیدا ہو رہی ہے۔ اس کے متعلق وسوسے پیدا ہونے بند ہو گئے ہیں ہمیں معلوم ہے۔۔۔ بھروسہ بھی ہے وہ اپنی ذمہ داریاں نبھائے گی۔۔۔ ہم نے محبت دی ہے تو ہمارا دل کیوں دکھائے گی۔"

بیٹی کا بڑا ہو جانا۔۔۔ خواب بھی ہے، عرصہ دراز بھی۔۔۔ پیدا ہوئی تو اتنی نازک سی تھی۔ گود میں لیتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا کہ کہیں اس کا بازو نہ مڑ جائے کوئی حصہ دب نہ جائے۔۔۔ گود سے اتار کر جھولے میں بٹھایا۔۔۔ پھر قدم قدم چلایا۔۔۔ دوڑتی ہوئی کیسی بھلی معلوم ہوتی تھی۔۔۔ وہ تم ہی تھیں جب دوڑتی ہوئی اچھل کر گود میں سوار ہو گئی تھیں۔۔۔ پھر ایک سال بعد اچانک مجھے دیکھ کر تمہارا سیڑھیوں سے ڈیڈی کہہ کر چلانا۔۔۔ ایک روز جب ہم گزرے ہوئے کسی افسردہ لمحات کے متعلق اور باپ بیٹی کے درمیان جذباتی لگاؤ کی بات کر رہے تھے تو میں نے پہلی بار تمہاری آنکھوں سے آنسو گرتے دیکھے۔۔۔ پھر میں بھی اپنے آنسو نہ روک سکا۔ میں کب چاہتا تھا کہ تمہیں رلاؤں۔۔۔ میں تو اپنے جذبات کی بات کر رہا تھا۔ میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔۔۔ میں خوش تھا کہ تمہارے دل کے کسی کونے میں۔۔۔ میں بھی بیٹھا ہوا ہوں۔

اچانک تمہاری عمر بڑھنے لگی۔ گیارہ، بارہ، پندرہ پھر سولہ سال کی ہو گئیں ۔۔۔ اگلے ماہ سال گرہ ہے ۔۔۔ ابھی چند ہفتے کی تو بات ہے جب میں وطن سے واپس آیا تو تم نے ائیرپورٹ پر مجھے مسکرا کر دیکھا پھر کسی مقدس کتاب کی طرح آگے بڑھ کر مجھے آہستہ سے اپنے سینے سے لگایا۔ اس رویہ میں کیسی روحانی محبت تھی ۔۔۔ تم میرے سامان کا کچھ حصہ اٹھا کر میرے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ چلتے چلتے ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے جا رہے تھے ۔۔۔ اس وقت مجھے ایک خاص طرح کی خوشی اور فخر سا محسوس ہوا ۔۔۔ تب میرے دل میں ایک خیال آیا کہ چار دیواری کے اندر پلنے والی بیٹی بھی باپ سے محبت کرتی ہے مگر اس کی محبت کا انداز اور ہوتا ہے اس کی محبت گونگی ہوتی ہے۔ بیٹی چار دیواری میں پلی ہو یا ترقی یافتہ ماحول میں، بیٹی ہو یا بیٹا، بچے غیر ہوں یا اپنے ان کے آداب یا انداز ان کی عمر کے مطابق اور تہذیب کے دائرہ میں ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں اگر کوئی اپنی جسامت اور بلوغت کو پہنچ کر خوش فہمی میں مبتلا ہو جائے تو ان کے طور طریقوں میں بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے ۔۔۔ میرے خیالات کا سلسلہ پھر ٹوٹ گیا۔

کار ایک چوراہے سے نکل کر پہلے آہستہ ہو گئی۔ پھر ایک چھوٹی سڑک پر مڑ گئی۔ راستہ تنگ تھا کیونکہ گاڑیاں دونوں فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ پارک کی ہوئی تھیں ہم اپنی منزل کے قریب آ گئے تھے ۔۔۔ میں نے سیٹ بیلٹ کا کلپ دبایا اور بیلٹ نکال دی ۔۔۔ ماجد صاحب نے اپنی سیٹ پر کچھ کروٹ سی لی اپنا سر گھما گھما کر ادھر ادھر بھی دیکھتے جا رہے تھے اور گاڑی کو آہستہ چلا کر دوسری پارک کی ہوئی گاڑیوں سے بچا بھی رہے تھے۔ پیچھے بیٹھی ہوئی خواتین جو کچھ عرصہ سے خاموش تھیں پھر سے چہکنے لگیں۔ مکان کے نمبر پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں بعض مکانات کے نمبر ہلکے اندھیرے میں بھی پڑھے جا سکتے تھے ۔۔۔ بیٹی نے اونچی آواز میں کہا ۔۔۔ ہاں وہ ہے مکان جہاں تین کاریں قریب قریب کھڑی ہیں کار سے سب لوگ اتر آئے ۔۔۔ میزبان پہلے ہی دروازہ کھول کر کھڑے تھے ۔۔۔ بیٹی نے آگے جا کر گھنٹی بجا دی تھی۔ سیڑھیوں کے پاس سے گزرتے ہوئے ڈرائینگ روم میں داخل ہوئے اندر پہلے ہی کچھ مرد حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ خواتین ایک طرف کھڑی تھیں۔ قریب نو بجے تک مہمان آتے رہے ۔۔۔ سلام، آداب ہاتھ ملانے کا سلسلہ ختم ہوا تو بیٹھنے بٹھانے میں تبدیلیاں کی گئیں ۔۔۔ آپ ادھر آ جائیے ۔۔۔ وہاں بیٹھ جائیے ۔۔۔ اس طرف

تشریف لائیے۔ وغیرہ وغیرہ یہ سب پڑھے لکھے اور باشعور لوگ تھے۔ ایک طرف خاموشی سے بیٹھے ہوئے دو لڑکوں کو دیکھ کر میں فکر مند ہوا ۔۔۔ کہ شاید لڑکی کوئی نہیں آئی ۔۔ بعد ازاں دو تین لڑکیاں بیٹی کے ساتھ ہنستی ہوئی آئیں ۔۔۔ میں جب ہال (راستہ) سے گزر کر باتھ روم کی طرف گیا تو وہاں چار پانچ لڑکیوں کا گروپ کھڑا ہوا تھا ۔۔۔ سب نے سلام یا ہیلو کہا ۔۔۔ اس طرح سات آٹھ جوڑوں کے ساتھ بارہ، چودہ لڑکے لڑکیاں بھی جمع ہوگئے ۔۔۔ دو لڑکوں کا بعد میں معلوم ہوا کہ انکی بہن اور ماں باپ ساتھ نہیں آئے۔ ایک صاحب صرف اپنے بیٹے کے ساتھ تھے چھوٹے بچے یا تو کسی کے تھے ہی نہیں یا وہ ساتھ نہیں لائے۔ لڑکے لڑکیوں کی عمر سولہ اور بیس سال کے درمیان تھی۔ سب لڑکیاں ایشین لباس میں بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ بعض نے ناخن بڑھائے ہوئے تھے۔ کچھ نے ہلکا یا گاڑھا میک اپ بھی کیا ہوا تھا۔

ایک خاص بات جس سے مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ وہ یہ تھی کہ سب بچے ٹوٹی پھوٹی جیسی بھی اپنی زبان میں بات کر سکتے تھے۔ میں نے جان بوجھ کر کسی سے انگریزی میں بات نہیں کی اور ان کی اردو زبان کے لہجے کا خوب مزہ لیا جب میں ان کے لب و لہجہ کی تعریف اور خوشی کا اظہار کرتا تو ان کے چہرے پر ایک فخر اور خوشی کی لہر دوڑتی ہوئی نظر آتی۔ اس جائز اور مناسب تعریف سے ان کی حوصلہ افزائی ہوئی ۔۔۔ اس طرح وہ بے تکلف ہوگئے اور میری بات غور سے سننے لگے۔ میں نے بھی ان کی باتوں میں دلچسپی لی۔ تمام لڑکے لڑکیوں کو بہت سمجھدار اور مہذب پایا ۔۔۔ میں شروع شروع میں اپنی بیٹی کے متعلق فکر مند تھا۔ کیونکہ ان میں کچھ نئے لوگ تھے۔ سوچتا تھا نہ جانے ان بچوں کی کیسی تربیت ہوئی۔

بچے صحت مند اور اچھے لباس میں ہوں تو ان کے نقش و نگار کی معمولی کمزوریاں چھپ جاتی ہیں۔ خود اعتمادی سے ان کے مسکراتے ہوئے چہرے بہت حسین لگ رہے تھے۔ ان بچوں نے ماحول میں ایک زندگی سی پیدا کر دی۔ میرا دل چاہا کہ چند سال اور زندہ رہوں۔ بیٹیاں سوفٹ ڈرنک، چائے، کوفی یا پان وغیرہ پیش کر رہی تھیں۔ بعض لڑکیاں بھائیوں کو محبت سے ڈانٹ ڈپٹ کر کے ان سے مدد لے رہی تھیں۔ ایک دو خاتون اپنے خاوند کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر انہیں سست بے ذوق یا گھر کے کاموں میں نااہل قرار دے رہی تھیں۔ مرد اپنی حاضر جوابی کا کمال دکھا

رہے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو بے معنی زبان درازی کر کے عورتوں سے ہارنا نہیں چاہتے تھے۔

دراصل ہوتا یہ ہے کہ ایک دو ہفتے بعد کسی کی سالگرہ یا شادی کی انیورسری کا بہانہ بنا کر پارٹی ہو جاتی ہے ورنہ ویسے ہی ایک دوسرے کو ٹیلیفون کر کے کوئی موسیقی یا ادبی محفل کر لیتے ہیں۔ یہ محفلیں عام طور پر صبح تین چار بجے تک چلتی ہیں۔

ایک خاتون نے دو لڑکوں سے پوچھا ..... کہ تمہاری امی اور ابا نہیں آئے ..... اس کے چند منٹ بعد وہ کمرے میں نہیں تھے ... ایک صاحب جو صرف بیٹے کے ساتھ آئے تھے ..... ان سے بھی کئی ایک نے ان کی بیگم کا پوچھا ... تو وہ اپنی بیگم میں کیڑے نکالنے لگے .. ایک دو خاتون نے اس میں گہری دلچسپی لی ..... اور مزید معلومات حاصل کرنا چاہی۔

ایک صاحب اپنی چرب زبانی کی وجہ سے لمبی چوڑی تقریر کر رہے تھے۔ اس میں زیادہ تر گفتگو کا حصہ کسی شخص کے پیسے اور کاروبار کا تھا۔ ایک محترم جب اس لمبی تقریر سے گھبرائے تو انہوں نے عالمی سیاست اور تازہ خبروں پر بات چھیڑی ..... فوراً پہلے صاحب نے اس موضوع پر بھی قبضہ کر لیا۔ اصل میں مسٹر چرب زبان کا بھی سارا قصور نہ تھا ..... ایک دو صاحب ان کے قریب ہی بیٹھے ہوئے طوطے کی طرح گردن ہلا کر ہر بات میں نہ صرف ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ بلکہ آنکھوں اور ہونٹوں کی کچھ اداکاری بھی کر رہے تھے۔ یہ سمجھنا مشکل تھا کہ ان سے ذاتی طور پر مرعوب ہیں ...... ان کی باتوں میں اتنی گہری دلچسپی ہے یا انہیں بنا رہے ہیں ..... ایک اور صاحب کچھ دیر بڑی بے صبری سے انتظار کرتے رہے۔ دو تین مرتبہ گفتگو میں شامل ہونے کی کوشش کی، آخر وہ قریب بیٹھے ہوئے ایک اور صاحب سے اردو ادب اور کلاسیکل موسیقی پر بات چیت کرنے لگے ..... جو صاحب اپنے بیٹے کے ساتھ آئے تھے۔ انہوں نے سطحی سے دلائل دے کر عورت کی ذمہ داریوں کو گنا اور آجکل کی خواتین پر نکتہ چینی کی ..... ایک اور صاحب نے فوراً ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور دور بیٹھی ہوئی اپنی بیگم کی طرف دیکھا۔

ایک محترم جو پرانی وضع قطع کے مالک تھے خاموش بیٹھے ہوئے تھے دھیمی آواز میں کہنے لگے ..... "دراصل " ..... ان کے لب ہلے تو مردوں کا گروپ ان کی طرف متوجہ ہوا ..... اور خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔

انھوں نے پھر اپنی بات شروع کی ۔۔۔۔ "دراصل بعض لوگ علم کی کمی یا تنگ دلی کی وجہ سے آزاد خیالی اور بے حیائی کے فرق کو نہیں سمجھتے۔ ایک طریقے سے اور ایک خاص حد تک ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع دینا۔ یہ آزاد خیالی ہے ۔۔۔ آپ کے علم میں اگر کوئی غلط کام ہو رہا ہے ۔۔۔ آپ جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیں اور خاموش رہیں اور جنسی بے راہ روی کے لئے راہ ہموار کریں یہ بے حیائی ہے جنسی آزادی پر پابندی یا آوارگی کو روکنا یہ مورل Moral ڈیوٹی ہے ۔۔۔ لباس پر بولنے پر اٹھنے بیٹھنے پر غیر ضروری پابندیاں عائد کرنا یہ جہالت ہے کوئی ایسی پابندی یا حرکت جو بچوں کی نشوونما کو روکے، ان کی خود اعتمادی میں کمی اور خوف پیدا کرے یا انہیں کوئی بات چھپانے یا جھوٹ بولنے پر مجبور کرے۔ یہ تربیت کی کمزوریاں ہیں" ان کی بات ختم ہوتے ہی ۔۔۔ میزبان کے ایک بے تکلف دوست نے کھانے کا ذکر کیا ۔۔۔۔۔۔۔ اور پوچھا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بھئی کھانا ملے گا یا نہیں"

ایک صاحب فورا بولے ۔۔۔۔ جو شاید خود بھی یہی پوچھنا چاہ رہے تھے ۔۔۔۔ ہاں بھئی کیوں نہیں ملے گا ۔۔۔ ضرور ملے گا ۔۔۔ مجھے تو طرح طرح کی خوشبوئیں بے چین کئے دے رہی ہیں۔

مردوں کی گفتگو کا جوش و خروش کم ہوا تو انھوں نے عورتوں کی گفتگو پر کان لگائے جو اپنے بچوں کی عمر اور ان کی پڑھائی وغیرہ کا ذکر کر رہی تھیں ایک صاحب کسی لڑکے کے متعلق تفصیل سے پوچھنے لگے ۔۔۔۔۔ دوسرے صاحب نے ایک کو آنکھ ماری کچھ دیر پہلے ایک نوجوان لڑکا جو ادھر ادھر گھوم پھر کر باتوں میں مشغول تھا ۔۔۔ ایک ٹرے لئے کمرے میں داخل ہوا ۔۔۔۔ تو سب نے تالیاں بجائیں ۔۔۔ ٹرے میں بہت سے گلاس تھے جن میں مختلف پھلوں کا رس تھا۔

دروازے کے پاس دو تین لڑکیاں کھڑی ہنس رہی تھیں ۔۔۔ غالبا اس لڑکے سے کام لینے میں ان کا کچھ ہاتھ تھا۔ جب دو چار لوگوں نے اس لڑکے کی مزید تعریف کی تو لڑکا کچھ شرما گیا۔ ان بچوں میں ایک خاص بات یہ بھی نوٹ کی گئی کہ جب تک ان کے پاس کوئی موزوں جواب نہ ہو ۔۔۔ بولتے نہیں ماں باپ ہلکے پھلکے طریقوں سے اور اشاروں کنایوں میں ایک دوسرے کے لڑکے لڑکیوں کا جائزہ لیتے رہے۔ اسی طرح بچے بھی ایک دوسرے کے ماں باپ کے متعلق جاننا چاہ رہے تھے۔ بعض دور دور سے اپنے ماں باپ کے متعلق بتا رہے تھے۔ زیادہ لڑکے لڑکیاں کالج یا اپنے

سکول کے آخری سال میں تھے دو تین نوجوان ایسے تھے۔ جو اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد اتنی کم عمر میں اچھی خاصی تنخواہیں لے رہے تھے۔ انہوں نے ایسے پیشے اختیار کئے تھے جن میں انہیں دلچسپی تھی ..... مجھے ان کی زندگی پر رشک آیا..... یہ سب کچھ انہوں نے بغیر لوٹ کھسوٹ، اپنی ذہانت سے کسی سفارش یا خوشامد کے بغیر حاصل کیا تھا..... ایک طرف تو وہ مغربی تعلیم اور تجربات سے گذر کر مغرب میں اپنا مقام بنا رہے تھے تو دوسری طرف ان میں مشرقی تہذیب کی خوشبو بھی تھی جس میں بزرگوں کا احترام اور خلوص و محبت شامل تھا۔ یہ دعویٰ تو مشکل تھا کہ سب کے سب لڑکے لڑکیاں جیسے نظر آرہے تھے ویسے ہی تھے..... مگر ان میں بہتر بننے ایک دوسرے سے سیکھنے کی خواہش نظر آتی تھی، اپنے اطوار سے ماں باپ کو متاثر کرنیکی کوشش کر رہے تھے..... بعض مرد ادھر ادھر بکھر گئے ..... چند خواتین اپنی جگہ سے ہٹ کر دوسری طرف مردوں سے باتیں کرنے لگیں۔ میں سامنے بیٹھی ہوئی خاتون کا انجانے میں جائزہ لینے لگا تو برابر بیٹھی ہوئی میری بیگم نے چپکے سے مجھے چٹکی کاٹی..... اور ایک خاتون کی باتوں کو غور سے سنے بغیر..... ہنس ہنس کر جی..... جی ہاں میں جواب دے رہی تھیں۔

دراصل اس میں میرا بھی زیادہ قصور نہ تھا۔ یہ خاتون اپنے ایک پاؤں کو آگے بڑھا کر ہلا رہی تھیں..... تو میری توجہ اس طرف جارہی تھی۔ حالانکہ مجھے ان کے پاؤں میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

ایک خاتون اپنے بھڑکیلے لباس اور حاضر جوابی کی وجہ سے چند مرد اور عورتوں کی نگاہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ بعض خواتین ان کو حسد سے کچھ رشک کے ساتھ دیکھ رہی تھیں اور ایک آدھ خوشامد کر رہی تھیں اس خاتون کی خوش اخلاقی مردوں کے ساتھ جب کچھ آگے بڑھی تو ان کے میاں کچھ فکر مند نظر آئے جب انہوں نے کسی موقعہ داخلت کی تو ان کی بیگم نے دھیمی آواز میں انہیں ڈانٹ دیا۔

ایک خاتون کچھ فاصلے پر بیٹھی ایک جاننے والے سے کچھ سوال جواب کر رہی تھیں کمرے کے درمیان اس خاتون کا خاوند دونوں طرف جلد جلد اس طرح سر گھما کر دیکھ رہا تھا جیسے ٹینس کا میچ دیکھ رہا ہو۔

میرے دوسری طرف بیٹھے ہوئے ایک شاعر اپنی تازہ نظم کا ایک شعر سنا رہے تھے۔ تو سامنے سالگرہ کا کیک بڑے اہتمام سے آرہا تھا میں نے ان کا شعر سنا اور داد بھی دی..... کہنے لگے۔

آپ نے غور نہیں کیا شعر پر "...... پھر کیک اور ویڈیو کیمرہ کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد ہم سب کیک دکھنے کے ڈرامہ کو دیکھنے لگے ..... کیک کاٹا گیا.... قہقہے لگے .... اچانک میرے بائیں طرف سینے میں بڑی تیز چبھن ہوئی .... میں نے آہستہ سے سینے کو ملا.... سامنے میری بیٹی کے برابر کھڑی ہوئی اس کی سہیلی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا.... پھر بیٹی کے کان میں کچھ کہا میں نے ایک دو لمبے سانس لیے پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا..... اس وقت تالیاں بج رہی تھیں ہیپی برتھ ڈے کا گانا ہو رہا تھا تالیاں بجیں..... ویڈیو کیمرہ ایکشن میں تھا..... لوگ پھر اپنی سیٹوں پر بیٹھ رہے تھے

بیٹی نے گھبرائی ہوئی آواز میں آکر پوچھا "ڈیڈی آپ ٹھیک ہیں"؟

"کچھ ٹھیک نہیں ...... مجھے پانی لا دو" میں نے کہا۔

بیٹی نے قریب ہی پڑے ہوئے ایک جگ سے پانی گلاس میں ڈال کر دیا.... میں نے پانی پیتے ہوئے گلاس کے اوپر سے دیکھا بیگم کچھ فاصلہ پر کھڑی ایک جوڑے کو پتہ وغیرہ لکھوا رہی تھیں۔ میں دل ہی دل میں اس پارٹی سے اسی طرح صحت مند گھر پہنچ جانے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ میں اس خوشگوار پارٹی کے خراب ہونے کی وجہ نہیں بننا چاہتا تھا.... ایک لحاظ سے مرنے کے لئے یہ کوئی غیر مناسب وقت بھی نہ تھا کیونکہ فیملی کا کوئی ممبر اب میرا محتاج نہ تھا۔

نوجوان لڑکے لڑکیوں نے پھر سے اپنی خدمات پیش کر دیں .... ڈائننگ روم میں میزوں پر برتن اور کھانا نہایت سلیقے سے لگا دیا گیا۔ کھانے میں ورائیٹی تھی فراخدلی اور محنت کا بھی دخل تھا ..... کھانا شروع ہوا..... تو اپنی اپنی پلیٹ میں اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق کھانے ڈال کر لیتے جا رہے تھے کسی گروپ کو خاص اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ مرد عورتیں اور بچے سب ہی آہستہ آہستہ کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے نہ کسی کا جلدی کی وجہ سے سانس پھول رہا تھا اور نہ ہی کوئی کھانے کے دوران داستان سنا رہا تھا ہلکی پھلکی کھانے کی تعریف ..... یہ لیجئے ..... یہ دے دیجئے .... کیا آپ یہ لیں گے.... قسم کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کم زیادہ، درمیانہ کھانے والے سب ہی تھے نہ کسی کو کم کھانے پر اعتراض نہ ہی کوئی کسی کو زیادہ کھانے پر مجبور کر رہا تھا جس طرح میزبان نے تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اسی طرح مہمان اپنی ذمہ داری نبھا رہے تھے ادھر ادھر چیزیں نہیں بکھیر رہے تھے۔ استعمال شدہ برتن ہٹانے اور صفائی رکھنے میں ہاتھ بٹا رہے تھے۔ ہر ایک کی بیوی بیٹی یا

بھن وہاں موجود تھی بات چیت اور طور طریقے میں ہر مرد ذمہ داری محسوس کر رہا تھا مگر پھر بھی ہر انسان ایک جیسا نہیں ہو سکتا ہر ایک کا اپنا نظریہ، اپنی پسند اور خیالات اور اپنے اپنے اخلاقی دائرے کھانے کے بعد آہستہ آہستہ سب لوگ پھر سیٹوں پر بیٹھنا شروع ہو گئے ۔۔۔۔ تاکہ ادبی اور موسیقی کی محفل کا آغاز ہو۔ ایک اسمارٹ اور رومانٹک بزرگ کو ایسی سیٹ چاہیے تھی جہاں سے تمام حاضرین صحیح نظر آ سکیں۔ کئی لوگوں کو ادھر ادھر شفٹ کیا گیا۔

ایک اور محترم بزرگ کا دعویٰ تھا کہ وہ مشرقی اور مغربی تہذیب کی خوبیوں کو سمجھتے ہیں مگر اس بات پر کچھ لوگوں کو تعجب ہوا۔ جب انہوں نے محفل شروع ہونے سے پہلے مردوں کو سیٹوں پر بٹھانے اور عورتوں کو نیچے کارپٹ پر بٹھانے کی تجویز پر ہاں کر دی۔ مگر بعد میں کسی تلخی کے ڈر سے اس میں ترمیم کر دی گئی ۔۔۔ کئی مرتبہ ان چھوٹی سی محفلوں میں صدارت اور نظامت کا ڈرامہ بھی ہوتا ہے ۔۔۔۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدارت اور نظامت کے لئے ہی یہ محفل کی گئی ہے۔

رات کے گیارہ بجے کے قریب دو تین شوقیہ موسیقار اپنے ساز و سامان کے ساتھ تشریف لائے اس وقت تک دو چار لوگوں نے اپنا کلام سنایا تھا اور بعض نے اپنی پسند کے اشعار سنائے تھے۔

موسیقاروں نے جب بہترین غزلیں وغیرہ سنانی شروع کیں تو پان چھالیہ اور میٹھی سونف کی طشتری ایک بار پھر حرکت میں آگئی ۔۔۔ کسی وقت بہت پرانے شاعر کی بہت رومانٹک غزل پر ایسا ہنگامہ اور داد دی جاتی کہ موسیقی اور موسیقار کی آواز دب جاتی ۔۔۔۔ موسیقار جب جانے کی تیاری کرنے لگی ۔۔۔ تو ایک دو باتھ روم سنگرز نے بھی پرانے گانوں پر اپنا گلا آزمایا اور داد حاصل کی صبح تین بجنے والے تھے۔ موسیقار اپنے ساز و سامان کے ساتھ چائے وغیرہ پی کر چلے گئے محفل اب آخری دموں پر تھی کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں ایک جوڑا اٹھ کھڑا ہوا انہیں کافی دور جانا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ سب تیاری کرنے لگے مہمانوں نے میزبان کا اور میزبان نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔۔ اور اپنے بیٹے بیٹیوں کو بلانے لگے۔ اگلی محفل کے پروگرام بننے لگے۔ پھر کسی نے کہا کہ اگلی محفل کا پروگرام ٹیلیفون پر سب کو بتا دیا جائے گا۔ سب لوگ ایک ایک کر کے باہر نکل رہے تھے کچھ لوگ ابھی بھی جوتے اور کوٹ تلاش کر رہے تھے۔ بائے بائے اور خدا حافظ کا کچھ شور سا ہوا۔۔۔۔ تو پڑوسیوں کے خیال سے کسی نے اشارے سے منع کیا سب لوگ گاڑیوں میں بیٹھ بیٹھ کر روانہ ہوتے

جارہے تھے جب ہم گاڑی میں بیٹھ کر بڑی سڑک پر پہنچے ۔۔۔۔ "محفل اچھی رہی ۔۔۔ کیوں صاحب" ماجد صاحب نے میری رائے مانگی

"جی ہاں کافی اچھی شام گذری" ۔۔۔ میں نے کہا

"نئے لوگ کیسے لگے آپ کو" ماجد صاحب نے پھر پوچھا"۔

میری صاف گوئی کی رگ پھڑکی ۔۔۔۔۔۔ اور کہنا شروع کیا" اس پارٹی میں شامل لوگوں کے متعلق یہ کہنا کہ یہ لوگ مکمل تھے۔ غلط ہوگا۔

میرے متعلق ان کی رائے کیا ہے، یہ وہ جانیں ۔۔۔۔ اتنے اچھے لوگ ہونے کے باوجود یہ بڑے قدرتی اور عام انسان تھے ان میں عام انسانوں جیسی خوبیاں اور کمزوریاں تھیں مگر ان میں کوئی برائی نظر نہیں آئی۔"

پچھلی سیٹوں سے ماجد صاحب کی وائف کی دوست کی آواز آئی۔ "اصل میں ہر شخص چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کی شخصیت سے متاثر ہوں" ۔۔۔۔۔۔ "ہاں ہاں شاباش بولو۔۔۔ ہم کیا مردوں سے کم ہیں" ماجد صاحب کی وائف نے لہک کر کہا ۔۔۔۔ پیچھے بیٹھی ہوئی تینوں خواتین اور بیٹی زور سے ہنس پڑیں۔

اس خاتون نے پھر کہنا شروع کیا ۔۔۔۔ "ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے پسند کیا جائے۔ انہیں یاد رکھا جائے۔ ان کی خوبیوں کو لوگ جانیں۔ اور ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے مگر ان تمام خواہشات کے ساتھ ہم بھول جاتے ہیں کہ ان سب باتوں کے حصول کے لئے کیا ذرائع یا ہتھیار ہیں ۔۔۔ مثال کے طور پر اگر ہم کسی کی عزت نہیں کریں گے۔ کسی کی شخصیت میں دلچسپی نہیں لیں گے۔ دوسروں کی خوبیوں کو نہیں سراہیں گے۔ تو ہم ان سے اس طرح کی امید کیسے کر سکتے ہیں مگر یہ سب باتیں ایسی نہیں ہیں، جو ہم نہ سمجھتے ہوں یا ان پر عمل کرنا محال ہو۔۔۔۔ تھوڑی توجہ اور مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی ایک عمل ہے جس سے ہم خوشگوار اور پر امن زندگی کے راستوں کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ہم اپنے نفع نقصان کو خو سمجھتے ہیں اس لئے کسی کو موقع نہ دیں کہ آپ کی مرضی کے خلاف آپ کو مجبور کرے کسی کی نقل کرنے کی بجائے ہر بات کو اپنی ترازو میں تولیں اور پرکھیں ۔۔۔ ارے کوئی اور بھی تو بولے ۔۔۔۔ میں ہی بولے جارہی ہوں" خاتون نے کہا اس کے بعد

دیر تک خواتین کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی مدھم آواز میں آپس میں کچھ باتیں کرتی رہیں ..... میرے سینے میں پھر وہی تکلیف ہوئی ..... جسے عرصے سے میں نے چھپایا ہوا تھا اور بیگم کو کبھی نہیں بتایا تھا ..... مگر چند سیکنڈ بعد درد پھر رک گیا۔

اپنے خاوند کے متعلق کچھ بتائیں یہ کیسے ہیں، کچھ دیر خاموشی کے بعد خاتون نے بیگم سے پوچھا۔

"یہ بس ایسے ہی ہیں ..... کوئی خوبی نہیں ..... بس ایک آدھ بات کچھ صحیح ہے ..... کہ جھوٹ نہیں بولتے اور کوئی بات مجھ سے نہیں چھپاتے میری طرح صاف گو ہیں ..... اندر اور باہر ایک ہی جیسے ہیں، بیگم نے کہا۔

مجھے کچھ فکر لاحق ہوئی ..... میں نے اپنی ایک خوبی کو بچانے کے لئے گھر میں داخل ہوتے ہی انہیں اپنے درد کے متعلق بتادیا

کہنے لگیں "یہ کوئی خاص بات نہیں کوئی وزنی چیز اٹھائی ہوگی"

"اچھا" .... یہ کہہ کر ..... میں مطمئن ہوگیا ..... اور فریج میں کوئی کھانے کی چیز ڈھونڈنے لگا.....

جینے کا فن

میں کسی زمانے میں بہت ہی پریشان شخص تھا۔ کاروبار میں جی نہ لگتا، پھر بھی دیر گئے تک کام کرتا۔۔۔۔ کسی وقت بھول سے اگر ہنسی آ بھی جاتی تو خود ہی فوراً سنجیدہ ہو جاتا۔۔۔ مجھے ایسا لگتا جیسے میں اپنے مرنے پر ہنس رہا ہوں۔۔۔ اس کے بعد فلسفیانہ باتیں سوچنے لگتا۔۔۔ انسان بھی کیا ہے کتنی آسانی سے اپنے غم کو بھول جاتا ہے۔۔۔ میرا دل کتنا نرم تھا دوسروں کی بھلائی کی ہی سوچتا۔۔۔ مگر تعجب ہے کہ جن کی بھلائی کا سوچا اور جس کو اپنی خوشیوں میں شامل کیا۔ انہوں نے میری روح کو بھی جلا دیا۔

میں اپنی بد قسمتی پر چھپ کر روتا۔۔۔ میں اپنے مسائل کسی قریبی دوست یا رشتہ دار کے سامنے نہیں کھولتا تھا۔ میں ان باتوں کو کم عمری سے ہی سمجھتا تھا۔ یہ بڑی تذلیل کی بات ہوتی اگر میں ایسا کرتا، مگر انتہائی پریشانی میں بھی کسی اجنبی کو اپنی آدھی کہانی سنا کر دل ہلکا کر لیتا۔۔۔ اس طرح کے لوگوں سے عجیب عجیب مشورے ملتے۔۔۔۔ بعض اوقات انسان کی عقل اور اس کی ذہنیت پر افسوس بھی ہوتا۔۔۔ ایک صاحب کہنے لگے۔۔۔۔ "اسے پکڑ کر خوب پیٹو"۔۔۔۔ کسی اور جگہ ایک صاحب رنگ و نسل کا قصہ لے بیٹھے۔ پھر کہنے لگے۔۔۔۔ "انسان بار بار تو دنیا میں نہیں آتا، سب سے بہتر طریقہ تو یہی ہے کہ طلاق دے دو۔۔۔ یہ بات انہوں نے گردن اکڑا کر کسی فلمی ویلن کی طرح سے کہی۔۔۔ ایسے لوگ میری کیا رہنمائی کر سکتے تھے۔

وقت گزرتا گیا اور میں نفرت کے الاؤ میں جلتا رہا۔۔۔ اندھیروں میں بھٹکتا رہا۔۔۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ ایک شریف آدمی نے مجھے اندھیروں سے نکالا اور میری زندگی ہی بدل دی۔

کہنے لگا" علوی صاحب، اپنی بیوی کے مسائل کو اپنے مسائل سمجھو اور اس کی جگہ کھڑے ہو کر دیکھو ..... اس کے لئے کچھ کر سکتے ہو تو کرو ..... اس سے کوئی امید نہ کرو۔

یہ بات کچھ اس طرح یا ایسے وقت کہی گئی کہ میں نے محسوس کیا۔ کہ اس بات میں وزن ہے۔

رفتہ رفتہ مجھے یہ خیال بھی آیا، کہ شراب میرے مسائل حل نہیں کر سکتی جب بھی شراب سے میں اپنے غم کو بھلانے کی کوشش کرتا ..... نشہ اترنے کے بعد یہ غم دوبارہ طوفان کی طرح آتا اور میرے دل و دماغ کو لے ڈوبتا ..... شراب نے مجھے متلون مزاج بنا دیا تھا اور میری صحت برباد ہو رہی تھی ... میں نے آہستہ آہستہ شراب کم کر دی، کم گوئی اختیار کی، اپنے پسندیدہ موضوع پر کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا، کبھی کتابوں میں دل لگتا، کبھی زبردستی پڑھتا اور پھر کتاب رکھ دیتا۔ یہ سلسلہ کچھ عرصہ جاری رہا، پھر کچھ ایسی تحریریں ہاتھ لگیں کہ آخرکار مطالعہ میں گہری دلچسپی پیدا ہو گئی چند ہی ماہ میں اپنے آپ کو نیا انسان محسوس کرنے لگا۔ میری صحت بھی بہتر ہونے لگی۔ میری مردہ روح میں کچھ زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔ مجھے کھانے پینے اور اچھا لباس پہننے سے ایک بار پھر سے خوشی محسوس ہونے لگی، کبھی کبھار صبح کی نماز سے طبیعت اور بھی پرسکون ہو گئی۔ میں لوگوں سے بات چیت میں پہل کرتا اور خوشگوار باتوں سے سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی کو ہنسا دیتا ..... اب میں کسی کینسر کے مریض کی طرح اکیلا پارکوں میں اداس نہیں گھومتا ..... مگر آج ... آج معاملہ کچھ اور تھا صدیقی صاحب کا اداس چہرہ دیکھ کر میری حساس طبیعت میں پھر افسردگی پیدا ہو گئی۔

صدیقی صاحب نہایت شریف آدمی تھے۔ ان کی معلومات وسیع تھی۔ مشکل سے مشکل اردو کا انگریزی ترجمہ کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ مشہور شاعر کی دو تین نظمیں کسی اردو اخبار کو انگریزی کالم میں اشاعت کے لئے بھیجیں جو انہوں نے فوراً شائع کر دیں۔ میں نے جب ایک دو ادبی شخصیات سے ان کا ذکر کیا تو انہوں نے صدیقی صاحب کی قابلیت کی تعریف کی۔

جب سے میں نے ٹریول ایجنسی میں کام شروع کیا ہے۔ اپنے لوگوں سے کافی جان پہچان بڑھ گئی ہے۔ صدیقی صاحب بھی یہاں کا، دو چار روز میں ایک آدھ چکر ضرور لگاتے ہیں۔ قریب ہی ایک اردو اخبار کا دفتر ہے۔ یہاں اکثر آتے جاتے رہتے ہیں کیونکہ میں ان کا کافی احترام کرتا ہوں اس لئے مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ان کے گول چہرے پر خشخشی داڑھی بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے کئی مرتبہ

جب وہ بات کرتے کرتے اچانک خاموش ہو جاتے ہیں۔ تو نیچے دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتے ہیں۔ منہ میں پڑی چھالیہ کو آہستہ آہستہ کٹکٹاتے رہتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی چھالیہ لے کر ایسے ہی چباؤں مگر جس نفاست اور مہارت سے وہ چھالیہ کو اپنے منہ میں گھماتے اور چباتے ہیں، شاید اپنے کمزور دانتوں کی وجہ سے میں ایسا نہ کر سکوں، ویسے بھی میں کوئی نئی عادت نہیں ڈالنا چاہتا۔

...... صدیقی صاحب کی مجھ پر نگاہ پڑی تو میرے منہ سے غلط بات نکل گئی

"آپ کو دو تین روز ہوئے دیکھا" میں نے صدیقی صاحب سے کہا۔

"کہاں دیکھا" صدیقی صاحب نے فوراً پوچھا۔

"جی ...... بار میں سے نکلتے ہوئے "...... میرا مطلب ہے شراب خانے سے نکلتے ہوئے" میں نے کہا۔

صدیقی صاحب ایک دم مجھ پر برس پڑے "اجی میں لعنت بھیجتا ہوں، شراب اور شراب پینے والوں پر" ان کی سفید خشخشی داڑھی کے بال اور بھی اکڑ گئے ان کی چھوٹی آنکھیں باہر آنے کی کوشش کرنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے گریبان کو پکڑ کر دونوں ہاتھوں سے مجھے اوپر اٹھاتے، میں نے جلدی سے معذرت کی اور کہا۔ "معاف کیجئے ...... غلط فہمی ہوئی ...... آپ ہی کی طرح کا کوئی اور شخص ہو گا"

دراصل، آج جب میں نے صدیقی صاحب کو زیادہ اداس دیکھا، تو برسوں پرانی عادت میرے اندر پھڑکی ...... میرا جی چاہا کہ صدیقی صاحب کے ساتھ شراب پیوں۔ شاید ایسے ان کا جی ہلکا ہو جائے ...... دراصل میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کہ میں ان کی کس طرح مدد کروں۔

پچھلے چند ہفتوں میں جس طرح کے گھریلو حالات انھوں نے مجھے سنائے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی طبیعت میں لچک نہیں ...... کچھ ضدی سے ہیں ...... ایک مرتبہ گفتگو کے درمیان فرمانے لگے "میں اصولوں سے نہیں ہٹ سکتا۔

"کیا آپ اب اپنی بیوی سے نہیں ملتے" میں نے پوچھا فرمانے لگے "اب کس لئے ملیں"

"آخر ہوا کیا"؟ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"بس ...... آ ...... آ آ عورت کی زبان چلتی ہے اور مرد" یہ کہہ کر صدیقی صاحب خاموش ہو گئے۔ دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔

میں نے پھر ہمت کی "کیا آپ قانونی طور پر علیحدہ ہو گئے ہیں؟"

ارے صاحب بس چھوڑیئے ان باتوں کو، صدیقی صاحب نے کچھ چڑ کر کہا۔ میں باورچی خانہ سے دو مگ چائے بنا کر لے آیا اور پوچھا ..... تین چمچ شکر کافی ہیں؟

کہنے لگے ..... ایک اور ڈال دیں اور بسکٹ وسکٹ ہٹا دیں، میں انگریڈینٹ چیک کئے بغیر بسکٹ نہیں کھاتا۔ میں نے بسکٹ ایک طرف کر دیئے۔

"آپ کے کتنے بچے ہیں؟" میں نے پھر چھیڑا ..... آج میں بڑی دیدہ دلیری سے سوالات کئے جا رہا تھا۔

"بس دو بچیاں ہیں" ..... یہ کہتے ہوئے ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اور خوشگواری نظر آئی۔ پھر کہنے لگے ..... "اتفاق سے ان کی تصویر بھی میری جیب میں ہے صاحب میں آپ کو دکھا بھی سکتا ہوں" صدیقی صاحب نے کمرے کے ارد گرد دیکھتے ہوئے اطمینان کیا کہ وہاں کوئی اور نہیں ہے۔ پھر ایک تصویر میرے آگے کر دی۔

دو افسردہ بچیاں عید کے کپڑے پہنے لندن کی مشہور مسجد کے باہر کھڑی تھیں۔

میں بڑے اشتیاق سے تصویر کو دیکھتا رہا ..... ان کے چھوٹے سے معصوم ذہنوں میں کیا ہو گا۔ میں سوچنے لگا۔ صدیقی صاحب نے بڑی افسردگی سے ایک لمبا سانس لیا اور تصویر پھر سے جیب میں رکھ لی۔

فرمانے لگے۔ "میں نے فوٹوگرافر سے بہت کہا کہ بھئی یہ فوٹو انہی لوگوں کو دو، جن کی یہ ہے ..... ان کی والدہ محترمہ پھر ہم سے لڑنے نہ چلی آئیں کہ یہ تصویر ہم نے کیوں اپنے پاس رکھ لی۔

پھر کہنے لگے "ابھی سات آٹھ روز کی بات ہے کہ عید کے روز دونوں بچیاں ایک چھوٹی سڑک سے گزر رہی تھیں، تو میں جلدی سے ایک طرف کو ہو کر نکل گیا۔ تاکہ وہ مجھے دیکھ نہ لیں۔"

مجھے ان کی اس حرکت پر تعجب ہوا۔ میں نے دل میں کہا ..... "او میرے خدایا ..... تم اور تمہارے اصول! ..... تم کتنے ظالم ہو ..... جیسی وہ عورت، ویسے ہی تم ..... نہ تم اس سے کم ..... نہ

وہ تم سے کم ...... عید کے روز تم ان بچیوں سے آنکھ بچا کر نکل گئے۔

کیا تم نے یہ نہیں سوچا کہ وہ بچیاں تمہیں دیکھنے کو ترستی ہوں گی اور جب وہ دوسرے بچوں کو ہنسی خوشی اپنے ماں باپ کے ساتھ دیکھتی ہوں گی تو ان پر کیا گزرتی ہوگی؟ ..... ممکن ہے جب تم آنکھ بچا کر گزرے، وہ تمہارے پیچھے بھاگتی ہوئی سڑک کے کنارے تک آگئی ہوں" یہ سب باتیں سوچتا ہوا میں چائے کے گرم مگ پر انگلیاں پھیر رہا تھا...... چند لمحوں کے بعد جب میں نے نگاہ اٹھائی، تو صدیقی صاحب کسی حساس بچے کی طرح خاموشی سے نیچے نگاہ کیئے بیٹھے تھے اور انکی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی

میری آنکھیں بھی نمناک ہوگئیں .... میں سوچنے لگا ...... حساس انسان اپنے اصولوں کے مطابق مطمئن تو ہو سکتا ہے۔ صبر و شکر بھی کر سکتا ہے رد کر جی ہلکا بھی کر سکتا ہے۔ مگر کبھی خوش نہیں رہ سکتا اس کے لئے کچھ اصول قربان کرنے پڑتے ہیں کچھ لے اور کچھ دے کا سودا کرنا پڑتا ہے۔

اونچی ایڑی

کھڑکی سے باہر جھانکنے کی ایک وجہ تو یہ تھی، کہ کھانے کے بعد میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک ٹرینی ڈاکٹر جو شاید مجھے غیر دلچسپ سمجھ کر تیسری سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسٹر بور سے محو گفتگو ہو گئے، جو کویت سے واپس آئے تھے۔۔۔ ان صاحب نے ایک ہی سانس میں کویت جانے کا اور اپنے کسی امیر رشتہ دار کا قصہ کہہ ڈالا۔ میں نے بھی اسے غنیمت جانا۔۔۔۔ اخبار اٹھا کر پڑھنا چاہا، کچھ دلچسپی پیدا نہ ہوئی۔ لکھنے کا بھی موڈ نہیں بن رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

معلوم نہیں آج آپ کا خیال کیوں آیا۔۔۔۔ انسان خوشی یا غمی میں ایسے انسان کا سوچتا ہے جس نے کبھی دل نہ دکھایا ہو۔ اس مرتبہ چھٹیوں پر آیا تو پاکستان کے تین بڑے شہروں میں کتنے ہی رشتہ داروں سے ملا۔ اس دوران گفتگو میں کچھ بد احتیاطیاں۔ ہوئیں، ملنے والوں میں بھی کچھ انسانی کمزوریاں نظر آئیں مگر یہ سب باتیں کچھ نئی نہ تھیں۔ ہم سب اس طرح کی باتیں کرتے ہیں پھر بھول جاتے ہیں مگر ایک بیٹی نے ان چھٹیوں میں کچھ ایسی بات کہی جس کا مجھے پہلے تو کافی صدمہ ہوا۔ مگر بعد میں اس کے بہتر رویوں سے اس صدمہ کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

چند منٹ پہلے کسی عمدہ پینٹنگ کی طرح ہوائی جہاز کی بیضوی کھڑکی سے بادلوں اور زمین کے قدرتی مناظر کو دیکھتے ہوئے دل و دماغ کچھ افسردہ سا ہو گیا ذہن اندر کی افسردگی کی وجہ تلاش کرتا رہا۔۔۔۔ ہلکے رنگوں سے بنی ہوئی اس وسیع پینٹنگ کو دیکھنے کے لئے آنکھیں کھڑکی سے باہر کے منظر کو گھورنے لگیں جیسے کسی نے باندھ کر بٹھا دیا۔ میں نے تھوڑا سا اوپر نگاہ کر کے دیکھا۔۔۔۔ حفاظتی بند باندھ لیجئے، کی لائٹ آف ہو چکی تھی میں نے آہستہ سے اپنی سیٹ بیلٹ کھول دی اور تھوڑا سا کھڑکی کی طرف گھوم گیا۔

اپنے رشتہ داروں سے ملنے ملانے کے چکر میں ایک ماہ کی بک بک کے بعد اس وقت جیٹ کے ہلکے شور سے کھڑکی کے باہر فضا میں گھورنا کتنا دلآویز ہے۔ سوچا وقت کاٹنے کے لئے اس سے خوبصورت اور کیا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ دل کتنا پر سکون ہے۔ قدرت کے بنائے ہوئے مختلف رنگوں کے پھیلے ہوئے اس وسیع شاہکار کی طرح جو میری آنکھوں سے ڈھل کر دل میں اتر رہا ہے۔ بادلوں سے چھن چھن کر نگاہ، مدھم مگر گہرے رنگ کے سبز کھیتوں تک پہنچ رہی ہے مٹیالے رنگ کی زمین کہیں کہیں خشکی کا پتہ دے رہی ہے۔ باریک باریک دھاگوں کی طرح پھیلی ہوئی سڑکیں اور پگڈنڈیاں کچھ باتیں کرتی ہوئی معلوم ہو رہی ہیں۔ ان پگڈنڈیوں اور کھیتوں سے آپ کی تصویر ابھرتی نظر آئی۔۔ پھر خیالات کا سلسلہ ماضی کے ساتھ ایسا جڑا کہ پرانی باتیں اور یادداشتیں دل ودماغ پر چھانے لگیں ۔۔۔۔ پھر آپ خوب یاد آئیں ۔۔۔ آپ کو کیا بتاؤں ۔۔۔ کہ ہم کیسے کیسے دور سے گزرے۔ آپ نے ایسی کنارہ کشی کی، جیسے آپ کو پہلے ہی اندازہ تھا کہ میرے ہاتھ کی لکیریں صحیح نہیں ۔۔۔ کاش آپ کے خطوط بھی ایسے ہی محفوظ رکھتا، جیسے آپ کی تصویر سنبھال سنبھال کر رکھی، آپ نے کتنی مشکلوں سے وہ تصویر مجھے دی تھی۔ مگر ہم نے جو کہا اسے نبھایا ۔۔۔ یعنی نہ تصویر کو پھاڑا نہ ہی کبھی آپ کو اشتہار بنایا۔

مجھ میں تو اتنی بھی ہمت نہ تھی کہ آپ کو اپنا نام بھی بتاتا۔ یہ آپ تھیں کہ ایسے خطرناک ماحول میں میرے دل ودماغ پر محبت کا ایسا تاثر چھوڑا کہ ستائیں برس بعد بھی احترام، چاہت اور محبت کے گہرے اثرات موجود ہیں، آپ نے کچھ ایسے پراسرار انداز میں محبت کی کہ اپنا دامن بھی بچائے رکھا اور مجھے بھی کسی خطرہ میں نہ ڈالا۔

ایک مرتبہ جب میں نے آپ کو دھمکی دی کہ جو تحفہ میرے کمرے کی کھڑکی میں ڈال گئی ہیں۔ واپس آپ کے گھر میں ڈالدوں گا۔۔ اگر آپ نے میری بھیجی ہوئی چیزوں کو نہ رکھا۔ آپ نے اپنے خط میں کس طرح میری دھمکی کا مذاق بنایا تھا۔ گویا یہ بات آپ اچھی طرح سمجھتی تھیں کہ شہر سے آیا ہوا میرے جیسا بزدل اتنی ہمت نہیں کر سکتا۔

ایک روز جب میں اپنے شہر چھٹیوں پر جا رہا تھا تو آپ نے بہت دیر تک پڑوسیوں کے گھر میرا انتظار کیا تاکہ مکان سے نکلتے ہوئے مجھے دیکھ سکیں اور الوداعی نگاہ ملے۔ اس وقت تک آپ کی

شادی نہ ہوئی تھی۔ اس روز آپ نے سفید سلکی ڈریس پہنا ہوا تھا۔ آپ بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ تین روز کی چھٹیوں میں معلوم نہیں کتنی بار آپ کی تصویر کو دیکھا ہو گا۔ کتنا اچھا لگتا تھا گھر والوں سے چھپ چھپ کر آپ کی تصویر کو دیکھنا۔ اس وقت تک آپ کا نام بھی معلوم نہ تھا۔

معاف کیجئے (Sorry) کی آواز پر میں اپنے خیالات سے باہر آیا۔ میں نے ذرا گھوم کر جوس کا گلاس پکڑ لیا اور ایئر ہوسٹس کا شکریہ ادا کیا میں جوس پیتے ہوئے پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا! اپنے ہی خیال میں اتنی پرانی باتوں کا سوچ کر اندرونی کرب محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنا چہرہ جیٹ کی کھڑکی میں پوری طرح چھپا دیا۔ میں اپنی نمدار آنکھوں کے ساتھ دل ہی دل میں آپ سے معافی مانگ رہا تھا۔

آپ کے خطوں میں کتنی محبت اور درد تھا۔ کتنی خوبصورت تحریر تھیں۔ ان خطوں کو پڑھ کر میرا دل محبت سے بھر جاتا تھا۔ ایک مرتبہ جب آپ نے اپنی شادی طے ہونے کا لکھا تو خط بے حد افسردہ تھا۔ آپ کتنا روئی ہوں گی۔ کتنے گلے کئے ہوں گے آپ نے مجھ سے ...... اس روز میں اپنے آپ کو آپ کا حقیقی مجرم سمجھ رہا تھا ..... جب میں نے آپ کے خط کے درمیان میں کہیں لکھا ہوا پڑھا "ایسا جی چاہتا ہے کہ دریا کی ریت پر بیٹھ کر روتی رہوں اور لوگوں کو چلا کر بتا دوں کہ مجھے تم سے محبت ہے"

مجھے ایسا لگتا تھا جیسے کہ آپ کے زیر سایہ عشق و محبت کا کوئی طالب علم ہوں ..... معلوم نہیں یہ سب رنگ ڈھنگ اور احتیاط آپ نے کہاں سے سیکھا اور ایسی جگہ جہاں قتل اور جذباتی جھگڑے صبح و شام کا معمول تھا۔

یہ تو میں پہلی ہی نگاہ میں بھانپ گیا تھا کہ گاؤں کی دوسری لڑکیوں سے آپ مختلف تھیں۔ مگر یہ بات کچھ عرصہ بعد سمجھ میں آئی کہ میرے پاس سمجھ بوجھ کے لحاظ سے آپ کو کچھ بھی دینے کو نہیں۔

چند ماہ نہ سہی تو ایک سال ہو گیا ہو گا۔ اتنے تھوڑے عرصے میں اتنی جذباتی خط و کتابت ہوئی جس سے چاہت کی شدید تڑپ پیدا ہو گئی۔ ایسے حالات میں انسان کوئی حماقت بھی کر سکتا ہے۔

شروع شروع میں جب میں آپ کے گاؤں میں رہنے لگا۔ تو اسکول سے آتی ہوئی آٹھ دس لڑکیوں کو گاؤں میں داخل ہوتے دیکھا ..... میں نے کنوئیں سے پانی لینے میں جان بوجھ کر دیر کر دی، جب لڑکیوں کا گروپ قریب پہنچا میں بڑے تعجب سے سب لڑکیوں کے پاؤں کو دیکھنے لگا .....

سوائے آپ کے سب کی سب ننگے پاؤں تھیں ان سب نے اپنی اپنی جوتیاں ہاتھ یا سر پر رکھی ہوئی تھیں ..... مجھے تعجب میں دیکھ کر کسی لڑکی نے آہستہ سے کچھ کہا تو سب کھل کھلا کر ہنسیں ... مگر آپ پہلے سنجیدہ رہیں میری طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرائیں ..... جیسے کہہ رہی ہوں ان کی بد تمیزی کا کچھ خیال نہ کیجئے ... میں نے بھی آہستہ سے سر جھکا دیا۔

ایک مرتبہ آپ نے محبت سے زردہ پکا کر بھجوا دیا تو یہ قدم مجھے کچھ مناسب معلوم نہ ہوا۔ کیونکہ یہ کھیل خطرناک ہو سکتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا ..... کہ آپ یا میں کسی مصیبت میں مبتلا ہوں کیوں کہ اس سے چند روز پہلے بڑا شرمناک ڈرامہ ہوا۔ جب میں اس گاؤں میں کمرہ یا چھوٹا مکان کرایہ پر دیکھ رہا تھا ایک شخص نے ہمدردانہ انداز میں مجھے بتایا تھا کہ اس گاؤں کے لوگ بہت شکی، متعصب، اور جذباتی ہیں اس لئے احتیاط کریں اور اپنے کام سے کام رکھیں۔

جب میں کرایہ پر کسی سے رہائش کا ذکر کرتا، تو پہلے یہ سوال ہوتا کہ کیا میں شادی شدہ ہوں ؟ اگر ہوں تو کیا فیملی بھی ساتھ رہے گی "... وغیرہ وغیرہ ....

ایک ریٹائرڈ فوجی افسر نے جب اپنے مکان کا ایک خالی حصہ کرائے پر دینے کی آفر کی تو کہنے لگا کہ ایک کرایہ ہر ماہ ایڈوانس تو ہو گا ہی مگر بڑی سمجھداری سے یہاں رہنا ہو گا۔ گرمی ہو یا سردی۔ دروازہ اور کھڑکیاں بند رکھیں جب تک کوئی خاص مجبوری نہ ہو۔ دفتر جائیں یا گھر آئیں بالوں میں مانگ نکال کر نہ گذریں اور سر پر ٹوپی یا کپڑا ڈھکا ہوا ہونا چاہئے۔ پھر انہوں نے گاؤں کی خوبیوں پر یہاں کے لوگوں کے طور طریقوں پر روشنی ڈالی جس میں زیادہ تر باتیں صحیح تھیں۔ بعض باتیں ایسی تھیں جن پر پردہ ڈال رہے تھے یا ان کے ذکر سے جان بوجھ کر گریز کر رہے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ اس گاؤں کے لوگ ایک خاندان کی طرح رہ رہے تھے ہر خوشی اور غمی کے موقع پر پورا گاؤں شامل ہوتا تھا۔ ہر بڑی عمر کی عورت ماں یا خالہ اور جوان عورت لڑکی، بیٹی یا بہن تھی، کسی اجنبی مہمان کے سامنے آ کر جوان لڑکی بیٹھ جائے۔ "تو چل اندر" قسم کے فقرے سنائی دیتے تھے گلی محلے میں اگر کوئی اجنبی یا بزرگ نہ کھڑا ہو۔ تو جوان لڑکیاں بغیر دوپٹے کے قابل قبول تھیں اگر کبھی عورتوں کی لڑائی ہو رہی ہو تو زبان کا کوئی بھی معیار قابل قبول تھا۔ خواہ ان گالیوں کا ترجمہ کچھ بھی ہو۔ سلام و دعائیں بے حد خلوص، مہمان نواز کسی طرح کی مدد میں ہر لمحہ تیار،

سادگی اور صاف گوئی میں اعلےٰ معیار اور نپے تلے اصول تھے۔

اس کے باوجود ایک روز جب میں دفتر سے آ رہا تھا گاؤں کا سب سے چوڑا راستہ جہاں سے ہو کر میں اپنے گھر پہنچتا تھا بے شمار لوگوں کا مجمع تھا۔ قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ایک دوکاندار اور اس کے والد کی چند لوگوں سے اچھی خاصی لڑائی ہوئی جسے بعد میں شریر بچوں نے جنگ جرمن کا نام دیا۔ پتھروں اور لاٹھیوں کا کھلا استعمال ہوا۔ چار پانچ لوگ بری طرح زخمی ہو کر ہسپتال پہنچے صحیح وجہ معلوم نہ ہو سکی۔

چند روز بعد اس سے بھی زیادہ شرمناک واقعہ ہوا۔ ابھی اس گاؤں میں مجھے آئے ہوئے صرف دو ماہ ہوئے تھے ہمارے ہی دفتر کے تین چار لڑکے دفتر سے واپسی پر بڑی سڑک سے گزرنے کی بجائے گاؤں کے اندر سے گزر کر جاتے تھے۔ میں نے خود انہیں دیکھا کہ وہ اکثر بے ہودہ پن سے قہقہے لگاتے ہوئے گزرتے تھے۔

ایک روز اپنی بالٹی لے کر کنویں سے پانی لینے کے لئے گھر سے نکلا تو بچوں عورتوں اور چند مردوں کو دوڑتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اپنی بالٹی واپس گھر میں رکھ دی اور اس طرف گیا جس طرف لوگ بھاگ رہے تھے راستے میں ایک نیم پاگل قسم کی لڑکی چیختی چلاتی ،گالیاں سی دیتی ہوئی اور ہنستی ہوئی اسی طرف جا رہی تھی۔ جو کہ ایک غریب بیوہ کی لڑکی تھی۔ کچھ ماہی منڈا ٹائپ لڑکی تھی اکثر ایک میلی اور پتلی سی قمیص میں بغیر دوپٹے گلی میں گھومتے پھرتے دکھائی دیتی تھی۔ جب میں تھوڑا فاصلے سے اس لڑکی کے پیچھے پیچھے چیختی چلاتی بھیڑ کے قریب پہنچا تو چند عورتوں اور بچوں نے چھوٹی موٹی چھڑیاں اور ڈنڈے اٹھائے ہوئے تھے ،ان تینوں چاروں لڑکوں کو سب نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

ماہی منڈا نے جب ایک لڑکے کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ ہے وہ جس نے مجھ سے مذاق کیا تھا۔ تو دو گاؤں کے لڑکوں نے دفتری بابو کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ گاؤں کی طرف سے لوگ چیونٹیوں کی طرح آ رہے تھے۔ جمگھٹا بڑھتا جا رہا تھا ..... اچانک چٹاخ چٹاخ کی آوازیں آئیں تو دفتری بابو نے اپنی بے گناہی کا چیخ کر اعلان کیا۔ دوسرے دو بابو معذرت کر رہے تھے سین کافی بد صورت تھا لیکن پھر بھی مجھے ان سے کوئی ہمدردی نہ تھی ....

آخری بار آپ کو سرخ عروسی جوڑے میں دیکھا۔ غالباً آپ کی شادی ہوئے دو تین روز ہوئے تھے۔
میں دوکان سے کچھ لینے کے لئے گھر سے نکلا تو آپ پر نگاہ پڑی اور دور سے آتے ہوئے دیکھا۔ جب کچھ
قریب آئیں تو دیکھا کہ اس وقت آپ گاؤں کی گنوار دلہن کی بجائے کسی کالج کی ایسی سمارٹ خاتون
لگ رہی تھیں جو کسی فینسی ڈریس شو سے آرہی ہو۔ اب آپ مجھ سے چند گز کے فاصلہ پر تھیں
گردن کو ذرا سا ایک طرف کو گرائے، لمبے لمبے قدم اٹھائے بڑے اعتماد سے چلی آرہی تھیں۔ لباس
نہایت اسمارٹ تھا۔ نہ بہت چست، نہ ڈھیلا ڈھالا۔ زیور بھی پہنے ہوئے تھے چمکتا ہوا ٹیکا پیشانی پر
جھول رہا تھا۔ ہلکا میک اپ بھی کیا ہوا تھا۔ جب آپ بالکل نزدیک آگئیں۔ میرا دل چاہا آج آپ کو
قریب سے جی بھر کر دیکھوں مگر مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ نگاہ بھر کر آپ کو دیکھتا رہوں۔ جب آپ
اور قریب پہنچیں تو اونچی ایڑی کی جوتی میں تھوڑا ٹھوکر سی کھائی ۔۔۔۔۔ میرے منہ سے ۔۔۔۔ اوہ ۔۔۔۔
یا اس قسم کی ہلکی سی آواز نکلی ۔۔۔۔ آپ سنبھل گئیں ۔۔۔۔ میں نے اچٹتی ہوئی نگاہ آپ کے چہرے
پر ڈالی تو آپ کے ۔۔ں پر تبسم تھا ۔۔۔ معلوم نہیں کیوں۔

اس کی کئی ایک وجوہات ہو سکتی تھیں۔

جب اس کی وجہ سوچتے سوچتے تھک جاتا ہوں ۔۔۔۔ تو آپ کے ٹھوکر کھانے کا منظر
آنکھوں میں گھومنے لگتا ہے۔ پھر میں سوچتا ہوں ۔۔۔ کہ خدانخواستہ ۔۔۔ اگر آپ گر پڑتیں ۔۔۔ تو
میں کیا کرتا؟

پھر ہوا کیا؟

وہ خوش شکل، پڑھی لکھی اور اردو ادب میں دلچسپی رکھتی تھی۔ چہرے پر شرافت، خوش خلقی اور معصومیت تھی۔ کوئی بھی مرد اسے دیکھتا تو اس کے دل میں ایک احترام سا پیدا ہوتا تھا لباس میں انفرادیت اور ایک سلیقہ تھا۔ خاندانی خاتون تھیں۔ ویسے تو خاندان کا مطلب آج کل سمجھنا بہت مشکل ہے۔ ہر کوئی خاندانی ہے ہم نے آج تک یہ کہتے کسی کو نہیں سنا کہ میرا خاندان معمولی ہے البتہ یہ کہتے ہوئے لوگوں کو سنا ہے کہ صاحب میں تو بد صورت سا آدمی ہوں یا میرا معمولی سا مکان ہے یا صاحب مزدوری کرتا ہوں عزت کی روٹی مل جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ!

عذرا کے قریبی حلقہ والوں کو تو معلوم تھا ہی کہ ان کے آباؤ اجداد شرفا میں سے اور خاندانی رئیس تھے، کوئی نیا جاننے والا بھی ان کی گفتگو اور اطوار سے سمجھ جاتا تھا کہ بڑے رکھ رکھاؤ میں ان کی تربیت ہوئی ہے۔ کئی قدامت پسند بھی عذرا کے خاوند ڈاکٹر اشفاق پر رشک کرتے کہ کیسی بیوی ملی ہے۔ تمام خواتین اس کو ایک ہی طرح چاہتی تھیں عذرا کبھی ان چکروں میں نہ پڑتی کہ فلاں ایسی فلاں ویسی ..... کبھی کسی کے متعلق کوئی تذلیل کی بات نہ کرتی تھیں۔ کسی ادبی محفل یا موسیقی کے جلسے میں اکیلی ہوں یا خاوند کے ساتھ ایک ہی رویہ ہلکی سی مسکراہٹ، آداب یا سلام کے بعد کوئی خاتون ہوں ایسے گھل مل جاتیں جیسے برسوں سے اسے جانتی ہیں۔ کوئی مرد ہو تو بیگم یا بھابی کیسی ہیں، بچے کیسے ہیں وغیرہ وغیرہ کے بعد مسکراہٹ غائب ہو جاتی جیسے کہہ رہی ہوں کہ آگے بڑھے تو میرے ہاتھ میں چھڑی ہے۔ پھر کس کی مجال کہ کوئی مرد خاص طور پر جس کو وہ پہلے سے نہ جانتی ہوں مزید گفتگو کو اپنا حق سمجھ لے ...... پھر دل ہی دل میں کہتی "نا بابا ان مردوں کا کیا بھروسہ خواہ مخواہ اپنے کسی رویے سے میرے خاوند کے دل میں بدگمانی پیدا کر دے" ......اس طرح کی باتوں پر ان کی ایک بے تکلف دوست نے کہا "آپ بہت پرانے زمانے کی بات کرتی ہیں" "کمال ہے آپ اکیلی کھڑی ہیں" ایک ادبی محفل میں ڈاکٹر اشفاق نے چائے کی پیالی اپنی بیگم کے ہاتھ میں تھماتے

ہوئے کہا۔

"کتنی ذہین اور دلچسپ شخصیتیں آپ کے گرد موجود ہیں" ڈاکٹر اشفاق نے پھر کہا

عذرا نے ناک کو ذرا سا سکیڑا جیسے کہہ رہی ہوں کہ آپ تو نہیں تھے نا۔

اشفاق اپنی چائے کی پیالی لئے ہوئے احتیاط سے دو چار لوگوں میں سے نکل کر دو تین لوگوں کے درمیان پہنچ گئے اور پھر مڑ کر اپنی بیگم کی طرف مسکرا کر دیکھا، اتنی دیر میں تین چار خواتین کے ایک گروپ نے عذرا کو آگھیرا...... سب نے اس طرف دیکھا جس طرف عذرا اپنے خاوند کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھیں۔

" اچھا دور دور سے رومان چل رہا ہے!" ایک خاتون نے فقرہ چست کیا.... تو سب ہنسنے لگیں۔

آہستہ آہستہ اور لوگ آتے جارہے تھے ...... خواتین کی خاصی تعداد تھی .... پرچ پیالیوں اور بات چیت کے ہلکے شور میں ایک خاتون نے پھر سے گفتگو شروع کی ... " اللہ تعالیٰ آپ کی جوڑی کو سلامت رکھے۔ آپ دونوں کو دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے ...... کیسی جوڑی ہے آپ دونوں کی قدرت نے جی بھر کر خوبیوں سے نوازا ہے "" بس کریں اب مجھ سے کیا غلطی ہو گئی " عذرا نے احتجاج کیا...... دوسری خاتون نے مسکرا کر جیسے ان کی بات کی تائید کی۔

پاس کھڑی ہوئی تیسری خاتون نے خوشامد میں ان کا سر چوم لیا ...... عذرا اور اشفاق کو جب بھی وقت ملتا ادبی محفلوں اور موسیقی کے پروگرام میں جاتے۔ لندن میں بعض اوقات ہفتے میں دو تین ادبی جلسے یا موسیقی کے پروگرام ہوتے... ان میں بعض ادبی جلسے کافی معیاری قسم کے ہوتے، جن جلسوں میں نہ صرف اچھی خاصی تعداد بلکہ انتظام نہایت اعلیٰ ہوتا جس میں ایشین کا ادبی طبقہ اور شائستہ لوگ شامل ہوتے۔ خواتین کی خاصی تعداد اور ایسے مرد بہت کم ہوتے جن کے پاس اپنی بیگم کو نہ لانے کا کوئی معقول جواز نہ ہوتا چند ایسے تھے جو اس ماحول کو ایک نعمت سمجھ کر اپنے آپ کو اس ماحول کے مطابق شائستہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ بعض اوقات کوئی ایسا شخص بھی آجاتا تھا جو اپنی بیوقوفی اور سادگی کی وجہ سے تفریح مہیا کرتا یا اپنی کسی حرکت سے برا تاثر چھوڑتا۔

ایک روز کسی معروف ادیب کی کتاب کی رونمائی تھی۔ ایک صاحب نے اپنی سیٹ چھوڑ دی جہاں عذرا اور ان کے ساتھ والی خاتون بیٹھنا چاہ رہی تھیں، اشفاق آگے کہیں اپنے جاننے

والوں میں بیٹھ گئے۔ ایک خاتون چار حضرات صدر اور سیکریٹری کے پاس سامنے اسٹیج پر بیٹھے تھے ۔ ایک دو کے علاوہ باقی حضرات کے مضامین خشک اور کافی لمبے تھے اس دوران عذرا نے غیرارادی طور پر اپنے دائیں اور نچلی سیٹوں کی طرف دیکھا تو وہ صاحب جنہوں نے اپنی سیٹ عذرا اور ان کے ساتھ والی خاتون کے لئے چھوڑدی تھی اس طرف مڑکر دیکھ رہے تھے عذرا نے اپنی نگاہ وہاں سے ہٹائی ۔۔۔ پھر دوبارہ ادھر دیکھا تو وہ شخص ابھی تک دیکھ رہا تھا۔ عذرا کو اس کا اس طرح دیکھنا اچھا نہ لگا۔۔۔ مگر اس نے دوبارہ اس طرف دیکھ کر غلطی کی تھی ۔۔۔ ہال میں اچانک تالیاں بجیں تو برابر والی خاتون نے عذرا سے کچھ پوچھا ۔۔۔ عذرا نے خاتون کی بات سمجھے بغیر کہا" معلوم نہیں " اس کے بعد عذرا کی توجہ بالکل سننے میں نہ تھی، اس کے ذہن میں ان شادی شدہ مردوں اور کنوارے لڑکوں کے چہرے ذہن میں پھرنے لگے جو اس کی شروع جوانی کے ایام میں اس کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان شادی شدہ میں ایسے مردوں کی تعداد زیادہ تھی جن کی بیویاں بچے پیدا ہونے کے بعد اپنی نسوانی کشش کھو چکی تھیں ۔ اور اب وہ گھر کی باعزت خواتین لگنے کی بجائے نوکرانیاں معلوم ہوتی تھیں ۔ وہ اپنے جسم لباس اور گفتگو میں بھی لاپرواہ ہوگئی تھیں ۔۔۔ حالانکہ وہ وفادار تھیں ۔ گھر کے فرائض بخوبی سرانجام دے رہی تھیں ۔ مگر شاید مرد عورت سے کہیں زیادہ حسن پرست اور عشق کا دلدادہ ہے ۔۔۔ مگر شادی شدہ تھا یا کنوارہ ان دنوں مردوں کی خوشامد اسے اچھی لگتی تھی ۔ اسے لگتا تھا جیسے پوری دنیا اس کے قبضے میں ہے ۔ کنوارے لڑکوں میں ایسے لڑکے رومان لڑانے میں بہت بے چین نظر آتے جن کے پاس جذبات کے علاوہ کچھ نہ تھا ۔ جو کنوارے لڑکے تعلیم میں کچھ آگے نکل گئے تھے یا مالی طور پر اس قابل ہو گئے تھے کہ وہ اپنے علاوہ کسی دوسرے کی بھی دیکھ بھال کر سکتے تھے ۔ وہ لڑکیوں کے سامنے بہت کم بولتے اور سنجیدہ رہتے تھے ۔ اپنی حیثیت اور شکل وصورت سے کئی گنا بہتر لڑکی چاہتے تھے۔

بڑی اماں (دادی) ایک کھلی کھڑکی کے سامنے تخت پر بیٹھی تسبیح کرتے ہوئے سب کو دیکھتی رہتی تھیں ۔ نہ جانے انہوں نے کتنی شادیاں ، سگائیاں اور تہواروں کے ہنگامے اور رونقیں دیکھی ہوں گی ۔ ہر عمر کے لوگوں کی رگ کو پہچانتی تھیں ایک روز کسی طرح مجھے انہوں نے پاس بلا کر بٹھایا اور سمجھایا تھا۔

کہنے لگیں بیٹی اللہ تعالیٰ نے تمہیں صحت اور شکل دی ہے۔ کچھ عقل بھی پلے باندھ لو تو تمام زندگی اطمینان سے بسر کروگی۔ ایسے غیر معیاری ذہنیت کے مردوں سے بچنا۔ جو تعریف اور خوشامد سے تمہاری توجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انسان بنیادی طور پر خود غرض ہے۔ بہت کم ہیں جو اخلاق اور محبت کی سرحدوں کو سمجھتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہیں۔ اخلاق، محبت اور ریاکاری میں فرق ہے۔ کسی کے لئے جگہ چھوڑ دینا یا ذہن صاف ہونے کے ساتھ تحائف دینا..... اخلاق ہے مگر اس کے بدلے میں کسی گناہ یا ناجائز معاوضے کی امید کرنا ریاکاری ہے۔ کسی کی تکلیف کو سمجھنا یہ محبت ہے۔ کسی کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دینا یہ قربانی ہے، اپنے اور پرائے کو سمجھنے کے لئے عقل و شعور کی ضرورت ہے۔ عقل و شعور حاصل کرنے کے لئے اپنے اندر دیانتداری پیدا کرنی پڑتی ہے۔ عقل اور چالاکی میں فرق ہے، چالاکی اپنی غرض و غایت کے لئے جائز اور ناجائز طریقے استعمال کرتی ہے اور شر پھیلاتی ہے۔ عقل سچائی کی تلاش میں رہتی ہے اور امن چاہتی ہے "..... جلسہ ختم ہوا ... لوگ تالیاں بجاتے ہوئے کھڑے ہو رہے تھے ..... عذرا اپنے خیالات سے باہر آئیں اپنے بائیں ہاتھ سے اپنے بالوں کو ٹھیک کیا۔ ..... ساڑھی کا پلو ٹھیک کیا ..... سیڑھیوں کے آخر میں ڈاکٹر اشفاق انتظار کر رہے تھے شعراء اور ادیبوں کی تصاویر لی جارہی تھیں لوگ ایک دوسرے کو راستہ دیتے ہوئے ایگزٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

عذرا اور اشفاق ہال سے باہر آگئے تھے۔ اشفاق اپنے ایک دوست سے باتیں کرتے ہوئے اوور کوٹ پہن رہے تھے کچھ فاصلہ پر سامنے چند خواتین عذرا کی طرف ہاتھ ہلاتی ہوئی گذریں۔ جب وہ گذر گئیں تو ایک شخص کچھ فاصلہ پر کھڑا ہوا عذرا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ غالباً ذرا سا مسکرایا.... یہ تو وہی شخص تھا جس نے اس کے لئے سیٹ چھوڑ دی تھی۔

عذرا کا موڈ خراب ہوگیا۔ عذرا نے غصے سے اشفاق کو کہا ..... چلیں اب اور ایک بازو کو کھینچا..... اشفاق کے دوست نے ہنس کر اشفاق سے ہاتھ ملایا اور عذرا کو بھی ہاتھ کے اشارے سے سلام کر کے چلا گیا..... اچانک آپ کو کیا ہوگیا.... چھوٹی سی بات پر "... اشفاق نے عذرا کو ازراہ مذاق کہا۔

اشفاق اور عذرا کو اپنے وطن سے لندن میں آئے ہوئے تقریباً دو سال ہوگئے تو ایک پیاری سی بچی پیدا ہوئی ..... دو سال بعد ایک اور بچی نے جنم لیا۔ عذرا اور اشفاق کی سوشل زندگی میں کچھ

تبدیلیاں ہوئیں مگر کوالٹی میں فرق نہ آیا۔ دس سال کیلنڈر بدلتے رہے ان کے ذاتی تعلقات میں معمولی اتار چڑھاؤ آتے رہے پھر ایک بچی اور ہوئی اس کے تین سال بعد ایک لڑکا پیدا ہوا۔ تین لڑکیوں کے بعد لڑکے کی خوشی کچھ دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ اشفاق تنہائی پسند ہونے لگے عذرا لے اندر کچھ محرومیت کا احساس جاگنے لگا اسے زندگی پھیکی اور بے مقصد نظر آنے لگی۔ دونوں کا وزن بڑھنے لگا مگر جلد ہی انہوں نے قابو پالیا۔ اشفاق لباس میں پہلے جیسے سمارٹ نہ رہے اور محفلوں میں دلچسپی نہ رہی۔ اپنا کام زیادہ پھیلالیا۔ انہیں سوشل زندگی کچھ بے رنگ سی نظر آنے لگی ...... ذہن میں وطن اور خاندانی رشتے چپکے رہے۔ عذرا نئے نئے لوگوں میں خوش تھیں۔ اسے خاندانی رشتوں سے کچھ مطلب نہ تھا۔ وہ رشتہ داروں کی سیاست میں نہیں پڑنا چاہتی تھیں نئے لوگوں کے میل جول میں یہ فائدہ ہے۔ اگر کوئی شخص پسند نہ آئے۔ اپنے خیال کے مطابق نہ ہو...... چھوڑ دو "...... یہ عذرا کا فلسفہ تھا۔

عذرا میں چار بچوں کے بعد بھی کشش تھی۔ اب وہ زیادہ میک اپ اور بھیڑکیلے لباس بھی پہننے لگی تھیں۔ مگر اس میں بھی سلیقہ تھا۔ گھریلو زندگی کچھ ویران ہونے لگی تو ابو کام میں مصروف رہتے۔ امی محفلوں میں اب ایک لڑکی انیس برس کی تھی جو کالج جارہی تھی۔ ایک لڑکی سترہ برس کی، جسے مزید تعلیم میں دلچسپی نہ تھی۔ چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کرتی رہتی چھوٹا لڑکا چار سال اور ایک لڑکی سات برس کی تھی ... میاں بیوی میں بے تکلفی اور اپنے خیالات کے اظہار کا لب ولہجہ بدلتا گیا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی بنتی گئیں ...... اشفاق اور عذرا کے اندر لاوا سا پکتا رہتا۔

عرصہ کے بعد جب کوئی بات سامنے کھل کر آتی تو تلخی پر ختم ہوتی ..... ایک روز ڈرائینگ روم میں داخل ہوتے ہوئے عذرا نے اشفاق سے کہا " آپ اپنے کام میں ہی مصروف رہتے ہیں۔ ہر شخص مجھ سے پوچھتا ہے کہ آپ کہاں ہیں ... اگر گھر پہ ہیں تو کوئی کتاب یا اخبار پڑھ رہے ہیں ... بیڈ پر ہیں تو سو رہے ہیں "

" اور آپ " اشفاق نے جل کر کہا " آج مشاعرہ ہے، کل ایک شاعر آرہے ہیں کلام کی اصلاح کے لئے پچھلے ہفتہ کسی کی سالگرہ تھی پرسوں موسیقی کی محفل ہے اور جب گھر پہ ہیں، بچے اپنے بیڈ روم میں ...... آپ اپنے ..... اور میں اپنے "

"تو اب آپ نے میرے بیڈروم میں کیا کرنا ہے۔ آپ کے سونے کے اوقات الگ میرے الگ" عذرا نے کہا "ہاں تو اگر مجھے آپ کے بیڈروم میں کچھ نہیں کرنا ...... نہ ہی ڈرائنگ روم میں میری موجودگی میں کسی کو دلچسپی ہے ...... تو پھر میرے اخبار یا کتاب پڑھنے پر آپ کو کیا اعتراض ہے" اشفاق نے کہا۔

آہستہ آہستہ یہ بحث بھی ختم ہوتی گئی ...... اشفاق اپنے کام میں مصروف عذرا اپنی محفلوں، پارٹیوں اور دوسرے مردوں کی چھوٹی چھوٹی مہربانیوں پر خوش گھر اب جہنم معلوم ہونے لگا۔

بچے اکیلے گھر میں کھیل کود کرتے اپنے کمروں میں اسکول کے آرٹ کا کام کرتے یا وی سی آر پر پاپ سونگز سنتے۔ ڈاکٹر اشفاق نے اپنے میڈیکل کے علم میں اضافہ کیا تو اسے اکثر وطن بلانے کے لیئے سرکاری اور غیر سرکاری خطوط ملتے رہتے لندن میں بیس سال کے اندر یہ بچت کی کہ اتنے بڑے مکان کا قرض ختم کر دیا۔ جو دونوں کے نام تھا۔ اس مکان کی ایک منزل میں دوسری فیملی آسانی سے رہ سکتی تھی۔

اشفاق کی صحت اچانک گرنے لگی۔ اس نے ایسی ڈیوٹی لے لی۔ جس میں کم سے کم گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔

گھر کے اخراجات میں کچھ مشکل پیش آنے لگی ...... تو ایک روز پھر اشفاق اور عذرا کے درمیان بہت تیز طرار بحث چھڑ گئی۔ دونوں اونچی آواز میں بولنے لگے۔ دونوں کے دلائل اپنی جگہ صحیح تھے۔

عذرا نے دھیمی آواز میں کسی طنز یا طعنہ کی بات کی تو بحث غلط رنگ اختیار کر گئی اشفاق نے دانت پیس کر کہا "اخراجات میں کمی کریں"

عذرا نے کہا "اخراجات میں کمی نہیں ہوگی ..... میں کام کروں گی اور مکان کے نچلے حصے میں کرایہ دار رکھ لیے جائیں۔

"عورتوں کی آمدنی میں برکت نہیں ہوتی۔ اشفاق نے کہا۔

عذرا نے اسے جہالت کہا اور ان کے خاندان پر حملہ کیا ...... ماضی اور حال کو خوب کوسا ..... اس شادی کو بدقسمتی کہا۔

اشفاق چلایا "کام کیے بغیر اتنی خودسری ہے کام کرنے کے بعد کیا ہوگا اور یہ کہ سب سے

بڑی جاہل تو تم خود ہو" عذرا طنزیہ زور سے ہنسی! اور کچھ عجیب سی آواز نکالی .... دونوں غصے میں اور اونچی آواز میں بے معنی باتیں کر رہے تھے تینوں بچے اپنے کمروں سے دوڑتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آگئے سب سے بڑی لڑکی جو دروازے کے پاس ہی کھڑی ہوئی کچھ سن رہی تھی اندر آگئی ...... دونوں چھوٹے بچے آنسوؤں سے رونے لگے جو عذرا کے ساتھ ہی کھڑے تھے۔ دوسری بڑی لڑکی صوفہ سیٹ کی سائیڈ چیئر پر آکر بیٹھ گئی۔

سب سے بڑی لڑکی جو ابھی تک کھڑی تھی ..... دھیمی آواز میں آہستہ سے بولی

"ابو اس ملک میں عورت کے لئے کام کرنا اتنا مشکل نہیں ہے .... نہ تو اسے کوئی برا سمجھتا ہے ..... میرے خیال میں نہ یہ کوئی کردار کی کمزوری ہے ..... اپنی زندگی کے معیار کو بہتر رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ گھر کے زیادہ سے زیادہ بالغ افراد کام کریں ...... اپنے لئے کام کرنے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔"

اشفاق نے اس کی طرف نرمی سے دیکھا ...... پھر آہستہ سے کہا "اپنے لیئے" .....

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر عذرا اور دونوں بڑی لڑکیاں چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

دونوں بچے اشفاق کے پاس آکر کھڑے ہو گئے .... ٹیبل لیمپ کی روشنی ان کے چہروں پر پڑ رہی تھی اشفاق فرش کو گھور رہا تھا..... دو تین منٹ کے بعد اس نے تھوڑا سا اپنا سر اٹھا کر ان دونوں کی آنکھوں میں دیکھا۔ لگتا تھا جیسے ان کی معصوم روح بھی زخمی ہوئی تھی ...... اس خیال سے اسے بہت تکلیف ہوئی ...... اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی ..... دونوں بچے جواب میں مسکرانے کی بجائے اور قریب آگئے .... اشفاق نے آہستہ سے انہیں اور قریب کر لیا چند لمحوں کے بعد لڑکا ایک ریک کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس پر پڑی ہوئی ایک فریم میں لگی تصویر کو کچھ غور سے دیکھتا رہا پھر اسکا رخ اشفاق کی طرف کر دیا جو عذرا اور اشفاق کی شادی کی تصویر تھی..... اس کے بعد وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ لڑکی بک ریک کے پاس گئی اس نے فریم کی ہوئی تصویر کو الٹا کر لٹا دیا۔ اس کے معصوم ذہن میں نہ جانے کیا تھا اشفاق نے اپنا چہرہ ایک طرف کر لیا تو لڑکی اپنی جگہ سے ہٹ کر اشفاق کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

"ابو آپ رو رہے ہیں!" ..... ابو آپ کیوں رو رہے ہیں؟ بیٹی نے پوچھا
"بس کچھ عادت سی ہوگئی ہے" اشفاق نے آہستہ سے کہا اور پھر اٹھ کر تصویر کو سیدھا کر کے اپنی جگہ رکھ دیا۔

گھنٹی بجی ...... بڑی لڑکی نے دروازہ کھولا۔

عذرا نے آواز پہچان لی ان کے جاننے والے شاعر سحر آئے تھے ..... اشفاق بھی انہیں جانتے تھے۔ عذرا نے اونچی آواز سے کہا۔

"آیئے آیئے تشریف لایئے" "بہت دنوں بعد آنا ہوا۔

عمر ساٹھ سے اوپر ہی تھی مگر تھے بڑے زندہ دل اور دلچسپ۔ عذرا کے حسن اخلاق کی خوب تعریف کرتے تھے چائے کے بعد اپنا کلام سنایا اور مزاح کی باتیں سناتے رہے۔ اشفاق، عذرا اور بچے اس طرح ہنس رہے تھے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں کچھ دیر پہلے جو گھر میں جھگڑا ہوا تھا اس دلچسپ شخصیت نے اپنی باتوں سے تمام اثر زائل کر دیا۔

اچانک ایک اور گھنٹی بجی ..... کسی لڑکی نے دروازہ کھولا ...... عذرا تقریبا دوڑتی ہوئی گئیں دروازہ پر ایک خاتون کھڑی تھی۔ باہر دو کاریں کھڑی تھیں جس میں کچھ عورتیں اور مرد بیٹھے ہوئے تھے۔

عذرا ان کے ساتھ کسی موسیقی کے پروگرام میں چلی گئیں ...... رات دیر سے واپس آئیں۔

اس کے بعد عذرا کسی جلسے وغیرہ یا گھریلو محفل میں نظر نہ آئیں ...... نہ ہی اشفاق اور عذرا اکٹھے کہیں نظر آئے خواتین اکثر ایک دوسرے سے عذرا کے متعلق معلوم کرتیں ..... چار سال بعد کسی کے گھر پر قرآن خوانی میں مرد اور عورتیں ایک ہی کمرے میں بیٹھے سپارے پڑھ رہے تھے۔ عذرا ایک کونے میں بیٹھی ہوئی ایک خاتون کو اپنا قصہ سنا رہی تھیں ...... کہنے لگیں بس مردوں کی چاپلوسی اور ہر وقت کی تفریح نے مجھے خراب کیا..... "میرے مرد کو خود غرض اور غیر ذمہ دار عورتوں نے" ..... خاتون نے کہا..... "پھر ہوا کیا؟" خاتون نے عذرا سے پوچھا عذرا بولیں" ایک روز سحر اپنے اک نوجوان دوست کو جو شاعر بھی تھے اپنے ساتھ لائے ...... میں نے انہیں اندر بلا لیا..... اشفاق کے آنے کا وقت تھا مگر گھر پر نہیں تھے ...... کھڑے کھڑے باتیں ہو رہی

تھیں کہ کسی کتاب کے ذکر پر میں کتاب لینے اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ سحر اور وہ نوجوان اس طرف آنکلے ..... سحر نے ایسا باتوں میں لگایا..... اور پھر وہیں کرسی پر بیٹھ گئے ..... ان کے سامنے دوسرے شاعر بیڈ پر بیٹھ گئے ..... مجھے سمجھ نہیں آئی کہ انہیں یہاں سے ڈرائینگ روم کس طرح لے جاؤں تھوڑی دیر میں بڑی بیٹی چائے وہیں لے آئی تو میں بھی وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

عذرا نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا ..... جب اشفاق گھر پر آئے ..... بات بڑی تھی بھی اور نہیں بھی۔ میرے بیڈ روم میں میز پر چائے کی پیالیاں پڑی ہوئی تھیں ..... سحر باتھ روم میں گئے ہوئے تھے ..... میں کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی نوجوان شاعر جو دوسرے شہر سے آئے ہوئے تھے جنہیں پہلے کبھی میں جانتی بھی نہ تھی۔ میرے سامنے میری بیڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اشفاق چابی لگا کر اوپر آئے میں ان کے قدموں کی آواز پہچانتی تھی۔ خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھی رہی اشفاق نے میرے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ پھر کمرے میں آگئے۔ ان کے ہاتھ میں چھڑی تھی ..... میں کھڑی ہوگئی اس سے پہلے کہ میں تعارف کرواتی۔ میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تو سخت وحشت نظر آئی ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ جب انہوں نے اجنبی کو میری بیڈ پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔

اتنے میں سحر باتھ روم سے نکل آئے۔ سحر نے جب ہر ایک کے چہرے کی طرف دیکھا تو پریشانی اور بوکھلاہٹ میں کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔ ان کی زبان میں لکنت آگئی۔ کوئی صحیح لفظ منہ سے نہ نکل سکا۔

اشفاق کے ہاتھ میں لپٹی ہوئی چھڑی تھی انہوں نے۔ چھڑی کی نوک نوجوان شاعر کے سینے میں چبھوئی ..... تو میرا جسم کانپنے لگا سحر نے اپنے دوست کو کچھ اشارہ کیا تو دونوں تیزی سے باہر نکل گئے۔

اس کے بعد اشفاق ایک پیالی اٹھا کر میرے قریب آئے ..... انہوں نے پیالی میں بچی ہوئی چائے میرے منہ پر پھینکی۔ اس وقت میں نے سوچا اس سے تو بہتر تھا کہ وہ مجھے قتل کر دیتے ..... غلط یا سہی ..... میں نے ان کی روح کو بری طرح زخمی کیا تھا۔ میں بے حس کھڑی تھی ..... وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے ..... تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا وہ ان سرکاری خطوں کو پڑھ رہے تھے جو وطن سے آتے رہے تھے اور ان کا پاسپورٹ پاس ہی پڑا

ہوا تھا۔ پھر ہوا کیا؟ وہ خاتون کہنے لگی ...... عذرا نے اس خط کا ذکر مناسب نہ سمجھا جو پچھلے ہفتہ اشفاق کی طرف سے آیا تھا۔ کیونکہ ابھی تک اس کے متعلق وہ خود کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی ....

...... قرآن خوانی ختم ہو چکی تھی۔ عذرا اس طرف دیکھنے لگیں جہاں چند جوڑے گفتگو میں مصروف تھے۔ پھر اٹھیں اور وہاں جا کر ایک خاتون سے باتیں کرنے لگیں۔

پس دیوار

دروازے کی اوٹ سے ایک جانی پہچانی آواز آئی "معاف کیجئے میرے خیال میں میاں بیوی کہیں دور نکل گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جلد واپس آنے والے نہیں، اگر صرف چہل قدمی کا معاملہ ہوتا تو اب تک آگئے ہوتے آپ کو کہیں اور نہیں جانا تو شوق سے انتظار کیجئے"

"جی مناسب ...... چند منٹ اور سہی ...... آپ کا پوتا ماشاء اللہ کافی ذہین ہے" میں نے رک رک کر کہا۔

"بس پوتا کیا بیٹا سمجھئے ...... دیکھا جائے تو میں نے ہی اس کو پالا ماں باپ کے پاس تو اتنا وقت بھی نہیں کہ اس سے کبھی بات ہی کریں ویسے محبت بہت دکھاتے ہیں۔ خیر کرتے بھی ہیں۔ آج کل کا زمانہ اور ہے۔ ماں باپ کے پیار محبت کے طریقے اور ہیں اسی طرح بچے بھی پرواہ نہیں کرتے اور وہ بھی ان چیزوں کے عادی ہو گئے ہیں مگر سہیل مختلف ہے اس لئے کہ یہ میری سانسوں میں پلا ہے۔ ذرا باپ کی طرح باتونی بہت ہے اور ماں کی طرح ہر بات کو گہرائی سے سوچتا ہے۔ یہ خوش قسمتی سمجھئے کہ ہمارے ملنے والوں کے بچوں میں کوئی بھی اخلاق اور آداب سے باہر نہیں ہے۔ ماشاء اللہ سہیل کو تو کبھی اشاروں سے بھی منع کرنے کی ضرورت نہیں پڑی" خاتون نے کہا۔

یہ سن کر سہیل نے جو کہ گیارہ سال کا ہوگا اپنے دونوں کان اپنی ہتھیلیوں سے بند کر لیے۔

چلنے کے لئے جب کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تو سہیل نے میرا بازو پکڑ لیا۔

"تھوڑا سا تو اور انتظار کیجئے۔" آپ سے باتوں کا بہت مزہ آرہا ہے۔" سہیل نے خوشامدانہ کہا۔

"آپ کی تعریف جو ہو رہی ہے" میں نے ذرا چھیڑنے کے لئے کہا۔

"آپ اچھے آدمی ہیں الکل ایسی باتیں نہ کیجئے پلیز ...... بڑی امی کو معلوم ہے کہ ہم اپنی تعریف نہیں سن سکتے ہمیں شرمندگی ہوتی ہے۔ ایسے موقعوں پر ہمیں ڈر لگتا ہے کہ گھبرا کر ہم کچھ بک بک نہ کر جائیں اور کسی گستاخی کا باعث بنیں۔ پھر ہماری خوبیوں کا بھانڈا پھوٹ جائے"۔ سہیل نے کہا۔

اس پر میں نے زور کا قہقہ لگایا۔ دروازے کے پیچھے سے سہیل کی بڑی امی بھی کھل کر ہنس پڑیں۔

"میں آپ کے لئے چائے بناتی ہوں" سہیل کی بڑی امی نے کہا اس کے بعد ان کا سایہ دروازے سے ہٹتا ہوا محسوس ہوا۔

"چلئے اب کچھ دیر اور آپ سے باتیں ہو جائیں" سہیل نے بڑوں کی طرح ایک آنکھ کود باکر کہا۔

"چلئے دو چار منٹ اور سہی" میں نے کہا۔

"جی نہیں انکل کم سے کم ایک گھنٹہ اور" سہیل نے فرمائش کی۔

میں نے نفی میں جواب دیا۔

"چلئے ...... پچاس منٹ۔ چالیس منٹ، تیس، بیس، دس، پانچ ... نہیں نہیں سوری انکل، بس پندرہ منٹ پر مان جایئے" سہیل نے خوشامدانہ کہا۔

"مناسب میں نے کہا اگر آپ کی خوشی اسی میں ہے"

"انکل معلوم ہے کیا ہوا۔ بڑی امی سے نہ کہیئے" سہیل نے کہا۔ پھر سہیل نے میری ہاں نہ سنے بغیر کہنا شروع کیا "ہمارے پڑوس میں ایک بڑا خاندان رہتا ہے۔ دو تین سال پہلے اس گھر میں خوب رونق لگی رہتی تھی۔ پانچ لڑکیاں اور تین بھائی تھے۔ ایک ہنگامہ سا رہتا تھا۔ کئی بار میرا جی چاہتا، اس کھیل کود دھینگا مشتی لڑائی مار کٹائی شور شرابے اور قہقہوں میں، میں بھی شامل ہو جاؤں اور تمام دن وہیں گزاروں اپنے اسکول کے کام سے فارغ ہو کر اکثر اپنی چھت پر پردہ کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہو کر دیر تک ان لوگوں کو ان کے صحن میں بھاگ دوڑ کرتے دیکھتا۔ ایک روز سب سے بڑی لڑکی کی نگاہ مجھ پر پڑی تو اس نے ہاتھ ہلایا میں اس وقت مشکل سے آٹھ سال کا تھا۔ شرمندہ ہو کر اپنی دیوار کے پیچھے چھپنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ بڑی لڑکی نے پھر ہاتھ ہلایا۔ جواب میں میں نے بھی آہستہ سے ہاتھ ہلایا سب سے چھوٹی لڑکی نے جو پندرہ سولہ کے سن میں ہوگی۔ ہاتھ کے اشارے سے ہوائی بوسہ دیا اس پر بڑی نے ہنس کر اس کے سر پر چپت لگائی تو وہاں سب ہنسنے لگے۔ جس کے بعد بہن بھائیوں میں ہنسی مذاق میں مار پیٹ بھاگ دوڑ، گر پڑنے کا شور اور قہقہوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ میں وہاں سے ہٹ گیا کیونکہ بڑی امی نیچے سے آواز دے رہی تھیں اس کے بعد سے جب بھی میں وہاں کھڑا ہوتا تو چھوٹی ہوائی بوسہ کا اشارہ کرتی اور میں جواب میں صرف ہاتھ ہلا دیتا یہ تقریبا دو اڑھائی سال پہلے کی

بات ہے پھر اچانک ان کے گھر میں شادیوں کا ایسا سلسلہ جاری ہوا کہ تمام لڑکیاں صاف ہو گئیں رونقیں ختم ہو گئیں نہ وہ شور نہ وہ قہقہے سب سے بڑے لڑکے نے غالباً کسی دوسرے شہر میں ملازمت کر لی پچھلے سال دوسرے دو بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں اس کے بعد ان کے گھر سے اکثر ناخوشگوار قسم کا شور سنائی دینے لگا کسی وقت عورتوں کی چیخ میں مردوں کی آوازوں کے گرینیڈ سے پھٹنے لگتے اور رونے پیٹنے کی آوازیں آتیں۔ یہ شور پہلے شور سے بہت مختلف تھا اس میں نہ وہ قہقہے تھے پھر ایسا لگتا جیسے سب کچھ جلنے کے بعد آگ ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ سہیل نے افسردگی سے کہا۔ میں خاموشی سے یہ سب بڑے غور سے سن رہا تھا۔ سہیل نے پھر کہنا شروع کیا" پھر ایک روز دیکھا تو صحن میں کچھ راج مزدور کام کر رہے تھے اگلے روز دیکھا تو صحن کے درمیان ایک اونچی دیوار کھڑی تھی۔ جو نہایت بدنما لگ رہی تھی مگر چیخنے چلانے کی آوازیں پھر بھی آتی تھیں مگر کچھ کم"

"انکل یہ دیوار کیوں کھڑی کر دی؟ "سہیل نے سوال کیا۔

"ایک ہی گھر میں ایک ہی خاندان کے لوگ دیواریں کیوں بناتے ہیں؟ کیا ماں باپ بہن بھائی ماں بیٹی اور میاں بیوی کے درمیان بھی دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ سہیل نے اس بار اپنے سوال میں مزید وضاحت چاہی" ایک روز ہمارے ماسٹر صاحب کہہ رہے تھے دل کے اندر بھی ایک دیوار ہوتی ہے۔ انکل لوگوں کو چاہئے کہ ان دیواروں کو اتنا اونچا اور مضبوط نہ بنائیں کہ ان کا گرانا بھی مشکل ہو ایسی دیواریں مجھے بہت بدنما لگتی ہیں ..... عجیب بات یہ ہے کہ میں پھر بھی پڑوسیوں کی اس دیوار کو دیر تک دیکھتا رہتا جس کے پیچھے دنیا کی سب سے حسین چیز چھپ گئی تھی جو مجھے سب سے زیادہ عزیز تھی"

"جی" بہت دیر کے بعد میں نے صرف اتنا کہا۔ سہیل جواب تک اداس لہجے میں یہ سب کچھ کہہ رہا تھا اچانک چہرے پر شگفتگی لائے ہوئے کہنے لگا "انکل ایک روز اچانک دیوار کے پیچھے سے چھوٹی لڑکی کا چہرہ نظر آیا غالباً کسی کرسی وغیرہ پر کھڑی تھیں۔ شادی کے کپڑے اور زیور پہنا ہوا تھا۔ وہ بے حد حسین لگ رہی تھیں۔ میرا جی چاہا اڑ کر ان کے صحن میں پہنچ جاؤں ان سے لپٹ جاؤں اور کہوں کہ ہمیں چھوڑ کر آپ کہاں چلی گئی تھیں۔ آپ ہمیں بہت یاد آئیں ..... سہیل نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا" میں نے دیکھتے ہی زور زور سے ہاتھ ہلایا تو انہوں نے بھی جواب میں

ہنستے ہوئے فوراً ہاتھ ہلایا۔ مگر ہوائی بوسہ نہیں دیا معلوم نہیں کیوں؟ تاہم میرے دل کی بے چینی ختم ہوگئی اور دیر تک مسرور رہا میرے دل میں ایک عجیب خیال آیا۔ انکل آپ ہنسیں گے جیسے اس کی شادی تو مجھ سے ہونی چاہیے تھی۔ اس روز سر کے درد کا بہانہ بنا کر میں بہت رویا اس کے بعد وہ کبھی نظر نہیں آئیں۔

"اور وہ دیوار؟"

"انکل کیا ان دیواروں کا گرانا آسان ہوتا ہے؟" سہیل نے اپنی اداس آواز میں پھر وہی سوال کر دیا۔

ڈرائنگ روم کے دروازے کے پیچھے سے آواز آئی۔ "سہیل"

سہیل نے اٹھ کر چائے کی ٹرے لے لی اور میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ شکر کتنی لیں گے؟"

مجھے خاموش دیکھ کر اس نے ایک چمچ چینی چائے میں ڈال دی۔ شائد اسے یاد آگیا کہ میں ایک ہی ڈالتا ہوں۔ میں ابھی تک سہیل کے سوال پر سوچ رہا تھا مگر امید کر رہا تھا کہ سہیل بھول جائے کہ اس نے مجھ سے کیا پوچھا تھا اور موضوع بدل جائے میں نے بغیر آواز کے ہلکا سا چائے کا گھونٹ لیا۔

"کھڑکی کے پردے آپ لوگوں نے کب بدلے" میں نے سہیل سے پوچھا

"جی یہ وہی ہیں۔ دن کی روشنی کی وجہ سے شاید آپ کو مختلف لگ رہے ہوں سہیل نے فوراً کہا۔

سہیل نے دروازے کی طرف دیکھ کر اطمینان کیا کہ اس کی دادی وہاں نہیں ہیں۔ اپنا سوال پھر دہرایا "انکل کیا دیواریں گرانا آسان ہوتا ہے؟"

میں نے پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا اکثر آسان تو ہوتا ہے مگر بہت کم ایسے ہیں جو اس کی طرف توجہ دیں اور معاملہ کو سمجھ سکیں کئی مرتبہ لوگ ڈرتے ہیں کہ کہیں اس کو گراتے گراتے خود بھی اس کے نیچے نہ دب جائیں۔ بعض ان نعمتوں کی لذت کو سمجھنے سے قاصر ہیں جو ان دیواروں کی غیر موجودگی سے میسر آسکتی ہیں۔ یہ دیواریں نہ ہوں تو روشنی تازہ ہوا پھول اور کلیوں کی خوشبو گھر کی رونق خوشگوار ماحول کی موسیقی اور کھلے صحن کا وقار میسر آتا ہے مگر ایسی دیواریں جو نظر نہ آئیں صرف ذہن اور دلوں میں ہوں حالات و وقت کے مطابق خوش اسلوبی اور فراخدلی کی وجہ سے منہدم ہو جاتی ہیں۔

"جی" سہیل نے قدرے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

مگر مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں اس سے کہوں کہ پرانی دیواریں جو بدنما لگیں ان کی طرف نہ دیکھا جائے تو بہتر ہے کیونکہ اگر ہم انہیں گرانے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو ممکن ہے وہ چیز جو دل و جان سے ہمیں عزیز تھی وہاں نہ ہو۔

تھوڑی ہی دیر بعد میں کسی بیمار ڈاکٹر کی طرح اپنی کار ڈرائیور کرتا ہوا جا رہا تھا۔ جو دوسروں کی بیماریوں کے علاج کو تو جانتا ہو مگر اپنے ذہنی اضطراب کا کچھ نہ کر سکے۔ پہلی مرتبہ جب میں اپنا وطن چھوڑ کر انگلینڈ گیا تو ایک دیوار تھی۔ وہاں گیا تو تنگ دلی کی اور دیواریں دیکھیں واپس آیا تو اپنے ہی ملک میں دیواریں ہی دیواریں نظر آئیں مگر اب اتنی عمر گزارنے کے بعد یہ سوچتا ہوں کہ ان دیواروں سے انسان کہاں بھاگ سکتا ہے۔۔

یہ سن کر کہنے لگی"

حکومت کا نیا پراجیکیٹ، نئی کالونی اور اس نئی آبادی میں زیادہ تر آفس اسٹاف اور فیلڈ میں عملی کام کرنے والوں میں نوجوان تھے۔ ان میں بہت کم ایسے تھے جو شادی شدہ تھے۔ جب بڑے افسران کہیں دورے وغیرہ پر جاتے تو سب ڈویژنل آفیسرز، اوورسیئرز، ڈرافٹسمین اور ہر درجے کا کلیریکل اسٹاف اپنے کام کی رفتار کم کر دیتا یا کرتا ہی نہ تھا افسران بھی ان باتوں کو سمجھتے تھے اس لیے وہ بھی کئی بار اپنے اسٹاف سے فالتو وقت کام کرواتے تھے۔ جن میں بعض افسر ایسے تھے جنہیں سرکاری کام سے کہیں زیادہ اپنے ذاتی کام میں دلچسپی ہوتی تھی۔ اپنی کوٹھی کی مرمت اور پینٹنگ، اس کا گارڈن، ٹرانسپورٹ، آفس کی سیٹنگ اور سجاوٹ، اپنی تنخواہ اور الاؤنس کے علاوہ خفیہ آمدنی اور کمیشن وغیرہ وغیرہ۔۔

ماتحت اسٹاف میں خوشامدی اور جن کے ذریعے سے افسر فائدہ اٹھاتا وہ بھی فائدے اٹھاتے بعض کم تنخواہ والے چھوٹے موٹے فائدے اٹھا کر ہی خوش تھے۔

ان دنوں سرکاری ملازمت ملنا مشکل تو تھی مگر سفارش ضروری نہ تھی زیادہ تر نوجوان ایسے تھے جن کی یہاں پہلی ملازمت تھی۔ تنخواہ اور پراجیکٹ الاؤنس کے علاوہ ہر ایک کو نئی تعمیر شدہ سرکاری رہائشیں بھی دی گئی تھی۔ بلندی پر بنی ہوئی یہ نئی کالونی دریا اور ایک بڑی نہر کے درمیان میں تھی صاف ستھری پہاڑوں کی طرف سے تازہ ہوا کے علاوہ چاندنی راتیں بھی بڑی خوبصورت ہوتی تھیں۔ ان خوبصورت راتوں میں کبھی کبھی چھڑے چھانٹ کنوارے لڑکوں کے

گروپ نہر یا دریا کی طرف سیر کے لئے نکل جاتے اور اپنی خیالی محبوباؤں کی یاد میں ٹوٹے پھوٹے گانے گاتے۔ کسی وقت آبشار بہتے ہوئے پانی کو دیکھتے اور واپسی پر ہنستے ہوئے یا گھر کی یاد میں اداس واپس اپنی رہائش کو لوٹتے۔

اس بے فکری کے ماحول میں گھروں سے دور ان دفتروں میں جب کبھی نوجوانوں کو فالتو وقت ملتا تو اپنی اپنی کرسیاں گھسیٹ کر جمع ہو جاتے۔ گفتگو میں طرح طرح کی باتیں چھڑ جاتیں۔ افسروں کے درمیان طاقت آزمائی اور دفتری سیاست، ایک دوسرے پر طنز طعنہ اور چھیڑ خانیاں کسی تجربہ کار کا کوئی قصہ سنانا، پھر کسی نئے شادی شدہ سے دلچسپ سوالات، اسی دوران کسی کو چائے پلوانے کے لئے زور دینا۔ بعض اوقات نہ صرف چائے بلکہ سرکاری کلب سے کیک پیسٹری اور شامی کباب بھی منگوائے جاتے مگر سب سے دلچسپ بات وہ سمجھی جاتی جب کسی نئے شادی شدہ نوجوان کو اس کی سہاگ رات کا قصہ سنانے کے لئے کہا جاتا۔

ایک روز ایک ٹائپسٹ کو گھیرا جو کسی پہاڑی علاقہ سے آیا تھا۔ اس کی عمر بیس اکیس کی ہوگی۔ لڑکا شرمیلا تھا۔ کسی سوال پر اچانک زور زور سے ہنسنے لگتا۔ پھر جب وہ سنجیدہ ہو کر بات شروع کرتا تو کوئی اس کا قریبی دوست گفتگو کے دوران چھیڑ خانی کی بات کر کے اسے غصہ دلا دیتا، اس طرح اس کی کہانی پوری نہ سن سکتے۔ اس طرح کی باتیں اس کے لئے نئی تھیں۔ اس کے لئے پہلے ہی یہ بڑی بہادری کی بات تھی کہ اتنے لوگوں میں بیٹھ کر اپنی شادی کی تفصیلات سنائے۔ اس کی کہانی بڑی معصومانہ اور دلچسپ ہو سکتی تھی مگر بد قسمتی سے صرف یہ معلوم ہو سکا کہ جس لڑکی سے اس کی شادی ہوئی اس کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ جب اپنے گاؤں سے دوسرے گاؤں جا کر شادی کی تو واپسی پر اس کی دلہن اور وہ خود ایک اونٹ پر بیٹھے تھے۔ پیچھے دوسرے لوگ پیدل، آگے آگے ڈھول اور نفیری بجانے والے تھے۔ جب وہ شرما کر اور اپنے دوست کے مذاق سے چڑ کر اپنے دفتر کے کمرے کی طرف چلا گیا تو بہت سے سوالات جو تہذیب کے دائرے میں ہو سکتے تھے سب کے دماغوں میں رہ گئے۔ مگر اس سے یہ ہوا کہ اس طرح کی کہانیاں سننے اور ان کی تعداد گننے کی بنیاد پڑ گئی۔

اسی طرح ایک ٹرانسپورٹ سپروائزر جاوید بٹ جو بعد میں سب ڈویژنل آفیسر ہو گیا تھا۔ بڑی دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا سرخ و سپید رنگ، چہرے کی کھال تنی ہوئی۔ گردن کسی

لنگل کی طرح جھٹکے کے ساتھ ادھر ادھر مڑتی تھی۔ آنکھیں چھوٹی اور گہرائی میں سیٹ ہونے کی وجہ سے وہ کسی وقت مضحکہ خیز معلوم ہوتا اس کی معمولی باتوں پر بھی ہنسی آجاتی تھی۔ حالاں کہ وہ خود کم ہی ہنستا تھا۔ اسے سہاگ رات کی کہانیوں میں بے حد دلچسپی تھی۔ چائے وغیرہ کے آرڈر دینے پر فورا تیار ہو جاتا۔ منت سماجت کرتا اور کہتا کہ اس طرح کی جب بھی کوئی میٹنگ ہو اور کوئی نیا شادی ہو کر آئے اور کہانی سنانے کے لئے پھنسے تو مجھے ضرور اطلاع کریں اور میرا انتظار کریں۔

کچھ عرصہ بعد بٹ صاحب ایک ڈیڑھ ہفتہ چھٹی پر رہے۔ اپنی شادی کی خبر چھپاتے رہے کیونکہ کسی دیہاتی علاقے میں دور دراز کہیں رہتے تھے۔ دفتر میں اس بات کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی گئی۔ کیونکہ چند لوگوں کو بلا کر باقی لوگوں سے ناراضگی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ شاید اس لئے بھی کہ انہیں سہاگ رات کی کہانی سنانی پڑے گی مگر اس کی شادی کی بات کہاں چھپی رہ سکتی تھی۔ جب اس نے فیملی رہائش کے لئے درخواست دی تو آہستہ آہستہ اس کی شادی کا سب کو پتہ چل گیا۔ ایک دو مرتبہ دوستوں نے سہاگ رات کی کہانی سننے کے لئے اس کو پھانسنے کی کوشش کی۔ مگر ہر مرتبہ ٹال جاتا یار مجھے شرم آتی ہے اس طرح کی ذاتی باتیں سنانے میں۔ کبھی کہتا بھئی میری جان چھوڑ دو کہاں پیچھے پڑ گئے ہو۔ میں گاؤں کا آدمی ہوں ہم سادہ لوگوں کی کیا سہاگ رات۔

تو نہیں اور سہی کئی زندہ دل کنوارے اور نئے شادی شدہ نوجوان آئے دن کسی کو گھیر لیتے اور ایسی مکھن بازی اور چاپلوسی سے کام لیتے کہ کچھ عرصہ بعد وہ خود بخود ہی اپنے ہم عمر لڑکوں اور بے تکلف دوستوں میں بیٹھ کر اپنی سہاگ رات، یا شادی کے شروع کے دنوں کی دلچسپ باتیں سنا دیتا۔ غیرہ شادی شدہ نہ صرف فن کے لئے بلکہ یہ سب کچھ اس لئے بھی سننا چاہتے تھے۔ کیونکہ عورت کے معاملہ میں ان کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھی۔

ایسے نوجوان خوابوں کی دنیا میں تھے ...... کوئی کہتا تھا ...... کہ میاں بیوی کے خیالات اگر مل جائیں تو بہترین زندگی گزرے گی۔ کوئی کہتا میری فرماں بردار نہ ہوئی اور میرا حکم نہیں مانے گی تو ایک منٹ میں باہر نکال دوں گا۔ بغیر کسی تجربہ کے اس طرح کی بیوقوفی کی باتیں کرتے جس کے کچھ معنی نہ تھے ...... انہیں کیا معلوم کہ خیالات ملنا کتنا مشکل ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ نوکرانی تو ہے نہیں کہ آپ ایک منٹ میں نکال دیں گے اس طرح کی باتیں سن کر ایک اکاؤنٹس کلرک نے کہا..... کہ

میری شادی کو چار پانچ سال ہوئے تھے۔ ہم میاں بیوی بہت خوش تھے اچانک حالات کچھ ایسے ہوئے کہ میں اپنے ماں باپ کے ساتھ نہ رہ سکا علیحدہ ہو کر جب دوسرے مکان میں رہنے لگے تو کسی بات پر میرا اپنی بیوی کو تھپڑ مارنا تھا کہ ایک طوفان آ گیا اس نے تو برقعہ پہنا اور بچوں کو چھوڑ کر اپنے ماں باپ کے پاس چلی گئی۔۔۔ میں تو سر پکڑ کر رہ گیا وہ بے حد وفادار اور نیک عورت تھی۔۔۔ مجھے شرمندگی ہوئی۔۔ ہمت کر کے وہاں گیا۔ علیحدگی میں اس سے معافی مانگی۔۔ اس طرح کی مختصر کہانیاں جب اٹھائیس ہو گئیں تو عرصہ تک نہ کوئی نیا شادی ہو کر آیا نہ کسی نے اس موضوع پر بات چھیڑی۔

یار کیا بتاؤں۔۔۔۔ چائے کا گھونٹ لے کر ایک گھاگ قسم کے کلرک نے ایک روز اپنا قصہ سنانا شروع کیا۔

میری پہلی بیوی بچے کی پیدائش پر فوت ہو گئی۔ دراصل ہم نے کسی تجربہ کار عورت کو یا اپنی کسی بزرگ عورت کو وقت سے پہلے اپنے پاس بلا کر نہیں رکھا میں نے سوچا نرس اور ڈاکٹر وغیرہ کو فوراً بلا لوں گا۔۔۔ میں کافی عرصہ رنجیدہ رہا پھر چار سال بعد دوسری شادی کی۔۔۔۔ خیر دوسری شادی کی بات بتانا چاہ رہا تھا۔ شادی کی رات سے پہلے میں نے سوچا اس دفعہ اپنی دلہن سے بات نہیں کروں گا۔۔۔ دیکھوں گا کہ وہ مجھے کتنی دیر تک نہیں بلاتی۔ میں خود اسے نہیں بلاؤں گا۔ جب میں اپنے کمرے میں گیا تو وہ گھونگھٹ نکالے خاموش بیٹھی تھی۔ میں خاموشی سے جا کر ساتھ پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد سگریٹ جلایا اور ایک میگزین پڑھتا رہا۔۔۔۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سگریٹ سلگا کر پیتا رہا۔ ایش ٹرے بھرتی گئی۔ اس طرح ایک گھنٹہ گزر گیا۔۔ کچھ دیر بعد اپنی بدتمیزی کا خیال آیا جب کمرے میں دھواں کافی ہو گیا۔ کچھ دیر اور اسی طرح بیٹھا رہا۔۔۔۔ نہ میں نے بلایا نہ دلہن صاحبہ نے میری طرف کوئی توجہ دی۔۔۔ جیسے بیٹھی تھیں بیٹھی رہیں۔۔۔۔ میں شلیف پر پڑے ہوئے ٹائم پیس کو چھیڑنے لگا۔۔۔ اسے کھول لیا۔۔۔ کل پرزوں کو دیکھتا رہا۔ بارہ بج کر کچھ منٹ ہو گئے۔۔۔ میں نے ٹائم پیس کو چھوڑ کر پھر وہیں پر رکھ دیا۔ باہر خاموشی تھی۔۔۔ صحن میں کسی کے چلنے پھرنے کی آواز نہ تھی برابر کے کمروں میں بھی کوئی نہیں بول رہا تھا۔ میں نے پردوں کو اچھی طرح بند کر لیا۔۔۔ جگ سے تھوڑا پانی لے کر پیا۔ دلہن نیند میں کچھ جھولنے لگی تھیں ایک آدھ جھٹکا سا لگنے کے بعد پھر ٹھیک ہو کر بیٹھ گئیں۔۔۔ اب میں بھی تھک گیا تھا۔۔۔۔ مجھے نیند آ رہی تھی میں بھی زیادہ

انتظار نہیں کر سکتا تھا میں نے انکے سرخ سینڈلز کی طرف دیکھا۔۔۔ پھر پاؤں کو دیکھنا چاہا تو نظر نہیں آرہے تھے۔ میں کرسی سے اٹھا اور مسہری پر ان کے پاس ہی جا کر بیٹھ گیا۔ پہلے تو اونگھ رہی تھیں اب چوکس ہو کر بیٹھ گئیں۔

انہوں نے اپنے پاؤں ڈھانپ رکھے تھے۔ میں پھر سینڈلز کو دیکھ کر پاؤں کے سائیز اور اس کی بناوٹ کا سوچنے لگا۔

مجھے لگا جیسے کوئی لاٹری کھلنے والی ہے یا قسمت کا کوئی فیصلہ ہونے والا ہے مجھے بھی تھوڑی سی گھبراہٹ ہوئی ۔۔۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں نظر آرہی تھیں جن پر مہندی اور نیل پالش لگی ہوئی تھی۔ گھونگھٹ میں سے شاید اس نے مجھے اس کی انگلیوں کو گھورتے ہوئے دیکھ لیا ۔۔۔۔ تو ہاتھوں کو بھی چھپا لیا۔ میں نے آہستہ سے گھونگھٹ اٹھا دیا۔ اس نے آنکھیں بند کئے ہوئے اپنا سر اور نیچے کو جھکا لیا۔۔۔۔ میں نے نام لے کر بلایا وہ کچھ نہ بولیں ۔۔۔ میں نے پھر بلایا انہوں نے آہستہ سے "جی" کہا ۔۔۔۔ مجھے آواز بڑی پیاری لگی ۔۔۔ چہرے پر بھی بھولا پن تھا۔۔۔ میں نے انکے چہرے کو آہستہ سے اوپر کو اٹھایا جب ان کا بازو پکڑا ۔۔۔۔ تو وہ کانپ رہی تھیں ۔۔۔۔ جسم گرم تھا ۔۔۔۔ انہیں خاصا تیز بخار تھا ۔۔۔

"مجھے آج معاف کر دیجئے" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولیں ۔۔۔۔۔ میرا دل پسیج گیا۔

میں نے کہا "آپ آرام سے سو جائیے کوئی فکر نہ کریں۔

" صبح سورج نکلنے سے تھوڑی دیر پہلے جب میں نے ان کے چہرے کو دیکھا تو چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس وقت انہیں بخار بھی نہیں تھا۔" ۔۔۔ اس پر سامعین کا زوردار قہقہ لگا اور سنبھل کر بیٹھ گئے۔

مگر مسٹر دوسری شادی ٹیبل پر پڑی ہوئی پلیٹ میں سے ایک کیک کا ٹکڑا اٹھا کر اپنی سیٹ سے کھڑے ہو گئے ۔۔۔ اور کہنے لگے "باقی پردہ اسکرین پر دیکھئے۔"

ایک دو نے ہاتھ پکڑ کر نیچے کھینچا۔ ۔۔۔ "ابے سالے اب ٹال نہیں پوری کہانی سنا"

مگر کہانی نمبر انتیس کے ہیرو کی کہانی ختم ہو چکی تھی ۔۔۔ دی اینڈ کہہ کر وہ ہنستا ہوا اپنی ٹیبل پر چلا گیا اور اپنے سرکاری کاغذات دیکھنے لگا۔

بٹ سے کسی نے کہا کہ "ہو جائے آج آپ کی کہانی بھی" ۔۔۔یار نہیں "یہ کہہ کر بٹ دفتر سے نکل گیا۔

چند دن بعد کچھ افسران دورے پر گئے ہوئے تھے۔ کہانی نمبر تیس کے لئے ایگزیکٹو انجینیئر کے اسٹینیو گرافر امجد کو پکڑ لیا۔ سات آٹھ نوجوان اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ بعض نے اپنے پاس سے چائے اور کباب وغیرہ آرڈر کرنے کی آفر بھی کر دی۔۔۔۔ لیکن وہ ہنس کر ٹالتا رہا۔ آخر میں وہ اپنے دوست ہیڈ ڈرافٹسمین رحمن کی میز پر بیٹھ گیا۔۔۔۔ چند منٹ بعد کچھ لوگ مایوس ہو کر چلے گئے۔۔۔۔ باہر بارش شروع ہو گئی تھی۔

رحمن کی میز کے پاس اب اوورسیئر سلیم اور امجد رہ گئے تھے۔

سلیم نے امجد کو پھر ذرا سا چھیڑا۔۔۔۔ "کیا خیال ہے امجد صاحب۔۔۔

"دراصل میری شادی کا فیصلہ کافی عرصہ پہلے ہے ہو گیا تھا" ۔۔۔ امجد نے آہستہ سے کہا۔۔۔ تیسویں کہانی شروع ہونے والی تھی۔ سلیم اور رحمن نے معنی خیز نگاہ سے ایک دوسرے کو دیکھا ۔۔۔۔ اندر ہی اندر دونوں خوش تھے کہ امجد نے انہیں اپنا دوست سمجھا۔ امجد نے سگریٹ کا آخری کش لگایا اور اپنی سگریٹ کو ایش ٹرے میں رگڑ کر بجھا دیا۔

امجد نے پھر سے کہنا شروع کیا۔ ایک دو ماہ سے میرے والدین کی طرف سے پھپھی پر زور دیا جانے لگا کہ اب ہمارا لڑکا برسر روزگار ہے ہمیں جہیز وغیرہ کی ضرورت نہیں ۔۔۔۔ اس لئے اب دیر نہ کی جائے ۔۔۔۔ ادھر میری ٹرانسفر کے آرڈر آ گئے۔ تاریخ طے ہونے پر لمبی چوڑی بحث ہوتی رہی ۔۔۔ آخر تاریخ شادی مقرر کر دی گئی۔ ہماری دونوں فیملیاں ایک ہی مکان میں تھیں۔ پھپھی اوپر رہتی تھیں، ہم لوگ نیچے رہتے تھے۔ چند روز کچھ رسومات اور گانے بجانے کا چکر رہا۔۔۔ پھر ایک روز نکاح کے بعد مجھے مکان کے اوپر کے حصہ میں بلوایا گیا۔ سہرا وغیرہ باندھنے سے مجھے نفرت تھی۔ ہاتھ پر مہندی وغیرہ بھی نہیں رکھوانا چاہتا تھا۔ مہندی وغیرہ سے مجھے معاف کر دیا گیا۔ مگر پھپھی کے اسرار پر سہرا باندھنا پڑا۔۔۔ اس سہرے کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے میں بھی دشواری ہوئی۔ اوپر لیجا کر ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ چند خواتین جنہوں نے سر وغیرہ تو خوب ڈھکے ہوئے تھے۔ مگر مجھ سے کچھ بیہودہ مذاق کئے۔ غالباً وہی بدتمیز عورتیں تھیں۔ جو بچوں اور عورتوں کے شور میں، جہیز اور بری کی باتیں کر رہی تھیں ۔۔۔۔ فلاں لوگ یہ لائے تھے اور ہم نے یہ دیا تھا۔ بری میں فلاں چیز نہیں ہے۔

جہیز میں یہ کیوں ہے؟ یہ کیوں نہیں ..... بعد میں پھپھی نے انہیں ڈانٹا .....

بات ابھی یہیں پہنچی تھی کہ جاوید بٹ نازل ہو گئے ..... کرسی گھسیٹ کر کہانی سننے لگے۔

امجد سے یہ کافی بے تکلف تھا ..... اسلئے گفتگو جاری رہی .....

"استاد اور باتوں میں ہمیں نہ ٹالو ..... اصل قصہ کی طرف آؤ" حسن نے اپنا سگریٹ جلایا۔

امجد نے کہا "خیر شام ہوئی ..... کھانا وانا جب ہو چکا ..... تو گیارہ بجے کے قریب ایک بزرگ خاتون نے بتایا ..... کہ تمہاری دلہن اس کمرے میں ہے ..... ورنہ جہاں چاہو سو جاؤ" ..... بات کچھ سمجھ نہیں آئی ..... "ورنہ جہاں چاہو سو جاؤ" ..... سوچا یہی طریقہ ہو گا ..... شریف لوگوں میں بتانے کا ..... کپڑے وغیرہ میں بدل چکا تھا ..... دانت صاف کیئے اس کمرے کے پاس پہنچا جس کا مجھے بتایا گیا تھا۔ آہستہ سے کمرے کے دروازہ کو دھکا دیا۔ اندر جا کر پھر دروازہ بند کر لیا ..... آہستہ سے چٹخنی چڑھادی۔

میری کزن جو اب میری بیگم تھیں ..... ایسا لگا جیسے یہ تھوڑا سا ہنس دیں

"جس پلنگ پر یہ بیٹھی تھیں ..... اسی پلنگ پر جا کر میں بیٹھ گیا

سلام کیا ..... کوئی جواب نہ ملا ..... پھر میں نے اسے اس کا نام لے کر بلایا ..... کوئی جواب نہیں ملا ..... میں نے کچھ لیکچر دیا ..... کہ انسان کا اخلاقی فرض ہے کہ ..... سلام کا جواب دینا چاہیے ..... میں تمہیں بلا رہا ہوں تب بھی کوئی جواب نہیں ..... پھر میں نے گھونگھٹ اٹھانا چاہا ..... وہ بھی اٹھانے نہیں دیا ..... کافی دیر پریشان کرتی رہی ..... پوچھا آخر کوئی وجہ تو بتاؤ ..... ہماری شادی ہوئی ہے۔ اب ہمارے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے ..... جب مجھے کچھ جواب نہ ملا۔ تو پھر مجھے غصہ آنے لگا ..... میں نے کہا اگر بیٹھنا ناگوار ہے یا یہ شادی تمہاری مرضی کے خلاف ہو گئی ہے اور تم خوش نہیں ہو یا بے وقت میں یہاں آگیا ہوں ..... تو چلا جاتا ہوں" اس کے بعد میں جانے کے لئے اٹھنے لگا ..... تو اس نے فوراً میرا بازو پکڑ لیا التجا سے کہنے لگی " بیٹھو ..... " اس کا اس طرح کہنا مجھے بڑا اچھا لگا ..... میرا غصہ فوراً ٹھنڈا ہو گیا۔ میں پھر وہیں بیٹھ گیا۔

خوب باتیں ہوتی رہیں ..... بچپن کے دنوں کی شرارتیں ..... بزرگوں کے عادات و خصائل اور ہنسی کی باتیں اور طرح طرح کے وعدے اور پروگرام بنتے رہے ..... پھر جب کچھ تھکاوٹ

ہوئی تو اٹھ کر لائٹ بند کرنے لگا۔۔۔ تو ہنسنے لگیں۔۔۔ میں نے تعجب سے دیکھا۔ پھر کہنے لگی۔۔۔
"ایک بات مانو گے۔۔۔ علیحدہ مسہری پر سو جائیں۔
"کیوں"؟ میں نے ذرا غصہ سے کہا۔۔۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی "شادی کی تاریخ غلط رکھی گئی۔۔۔ میں آج کل چھٹی پر ہوں۔
"کیسی چھٹی" میں نے ذرا اور غصہ سے کہا۔

اس نے رونی سی صورت بنا کر کہا۔۔۔ "جس طرح آپ کو دفتر سے چھٹیاں ہوتی ہیں۔ ہمیں بھی مہینے میں چند چھٹیاں ہوتی ہیں۔"

جب میں نے کچھ غور کیا۔۔۔ غصہ تو اتر گیا۔۔۔ مگر کوئی خوشی نہ ہوئی۔۔۔ اور خاموشی سے دوسری مسہری پر سو گیا۔ مگر اب اتنے روز گزرنے کے بعد۔۔۔ ہم کئی بار اس رات کا سوچ کر ہنستے ہیں۔

بیٹے تیرے ساتھ ٹریجیڈی ہوئی۔۔۔ بٹ نے مذاق سے کہا۔۔۔ پھر چاروں ہنسنے لگے۔

کلب کا ملازم ٹرے میں چائے اور کباب لئے آ رہا تھا۔۔۔ بٹ نے کسی سے کہلوا دیا تھا۔

ایک روز رحمٰن صاحب کے ریزیڈینٹ پر چند زندہ دلان خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ رحمٰن صاحب کی لاہور ہیڈ آفس میں ٹرانسفر کے آرڈر آ چکے تھے آفس میں ان کی میز کے گرد ہی یہ کہانیاں سنائی جاتی تھیں ان کی فیملی پہلے ہی لاہور جا چکی تھی۔ اس لئے ان کا گھر کلب بنا ہوا تھا چند دوستوں کی دعوت تھی اور تاش کی بازی چل رہی تھی۔

سہاگ رات کی کہانیوں کی بات چل نکلی۔۔۔ تو سب لوگ جاوید بٹ کی طرف دیکھنے لگے۔۔۔ کسی نے کہا۔ کہانی نمبر اکتیس ہو جائے اور مسٹر سلیم نے کہا۔۔۔ ہو سکتا ہے یہ آخری کہانی ہو۔۔۔ رحمٰن صاحب ویسے ہی جا رہے ہیں۔۔۔ جن کی وجہ سے اس طرح کی گپ بازی میں فالتو وقت اچھا گزر جاتا تھا۔۔۔ کسی نے بٹ کی طرف اشارہ کیا تو اس کے دوست سلیم اور اسد نے اس کو پکڑ لیا اور دھمکی دی کہ اگر وہ اپنی کہانی نہیں سنائے گا تو الٹا لٹکایا جائے گا۔۔۔ ممکن ہے اس سے بھی زیادہ کوئی سخت سزا ہم سوچ لیں۔ پہلے بٹ کچھ پریشان ہوا۔ اس کی چھوٹی آنکھیں اور اندر کو چلی گئیں۔۔ گردن کو جھٹکے مار کر کسی ایگل کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایک دو نے مکھن بازی شروع کر دی اور کہا نہیں نہیں۔ بٹ صاحب موڈ میں ہیں خود بخود اور اپنی خوشی سے سہاگ رات کی کہانی

سنائیں گے۔ وہ بھی صحیح صحیح اور سچی ..... پھر کسی نے یہ تجویز کیا کہ جس سے۔ بٹ صاحب کی بے تکلفی نہیں ہے وہ دوسرے کمرے میں جا کر تاش کھیلیں بٹ نے اپنی دونوں ٹانگیں ایک دوسری پر رکھ دیں اور کہنے لگا..... نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں سب سے بے تکلفی ہے۔ سب یار دوست ہیں... مگر یار سنانے کے لئے ہے ہی کچھ نہیں ..... بٹ نے سلیم سے مخاطب ہو کر کہا۔ میں گاؤں کا رہنے والا دیہاتی آدمی ہوں ..... ہمارے گاؤں کی لڑکیاں سادہ ہوتی ہیں ... میری سہاگ رات میں کوئی دلچسپ اور رومانٹک بات نہیں ہے جس طرح کی دلچسپ کہانیاں تم لوگوں میں سے بعض نے سنائی ہیں ..... کوئی لطیفہ وغیرہ کہتے ہو تو سنا دیتا ہوں.. نہیں نہیں ہمیں لطیفہ وغیرہ نہیں سننا اسد نے کہا.... سلیم نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اچھا یار..... تو سنو..... بٹ نے گلا صاف کیا اور کہا۔

میری شادی میری ماسی یعنی میری خالہ کی لڑکی سے ہوئی ..... دو تین سال میں جھگڑتا رہا کہ مجھے رشتہ داروں میں کسی لڑکی سے شادی نہیں کرنی.... میرے چاچے (باپ) نے مجھے دھمکی دی کہ اگر شادی میں جہاں کر رہا ہوں نہیں کرے گا تو مار مار کر تجھے گھر سے نکال دوں گا..... بڑا پریشان ہوا۔

بے بے سے کہا (والدہ) "کہ کوئی مدد کرو" ..... اس نے بھی صاف جواب دے دیا اور کہا کہ اس معاملہ میں کچھ مدد نہیں کر سکتی۔ میں نے تمہاری حمایت کی تو وہ مجھے بھی ڈنڈے مار کر گھر سے نکال دے گا۔

یہ تو بڑی زیادتی ہے... میں نے بے بے (والدہ) سے احتجاج کیا۔

بہر حال مرتا کیا نہ کرتا..... ہاں کر دی ..... چاچا اس طرح خوش ہو گیا.... جیسے اس کی شادی ہو رہی تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ گاؤں کے رواج کے مطابق پورے گاؤں کے لئے چاول وغیرہ پکائے گئے.... ڈھول ڈھمکے ...... مراثیوں اور زنخوں نے دو تین روز تک گاؤں کے لوگوں کے لئے تفریح مہیا کی اوپر۔ جھنڈیاں نیچے قناتیں شامیانے اور کچی نالیاں۔ گاؤں کا چھوٹا بڑا سب خوش ..... ان سب کی خوشی کے لئے چاچا نے مجھے قربانی کا بکرا بنایا ہوا تھا۔ کسی معاملہ میں میری مرضی یا رائے شامل نہ تھی ..... بلکہ چاچا تو کسی کا بھی مشورہ ضروری نہیں سمجھتا تھا طرح طرح کے اخراجات میں ادائیگی کے وقت وہ۔ جھگڑتا تو فیملی کا کوئی اور ممبر ادائیگی کر دیتا۔ پیسے ادھر ادھر چھنکاتا پھر رہا تھا۔

لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ اور پہلے سے زیادہ شور مچا رہا تھا۔ دو گھٹیا قسم کے مراثی جب پیسے لینے آئے تو انہیں بھی ایک دو گالی سنادی ۔۔۔ اس تمام شور شرابے اور رونق میں چاچا اس طرح تھا۔ جیسے چھوٹی سی ریاست کا نواب۔ اس روز کئی دشمن بھی لمبے لمبے ہاتھ کر کے ایک دوسرے سے ہاتھ ملا رہے تھے پھر اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے تھے۔

نکاح کے بعد ایک کھانا ہوا۔۔۔۔ جو مہمان دور سے آئے تھے شام کو پھر ان کے لئے کھانا پکایا گیا۔

میں کافی تھک گیا تھا۔ گرمی کے دن تھے ۔۔۔ شام کو کچھ گرمی کم ہوئی۔

سارے صحن میں اور گلی میں چالیس پچاس چارپائیاں بچھادی گئیں ہلکی سی ہوا چلی تو خاموشی بھی ہوگئی۔ مگر کچھ لوگ ابھی بھی جاگ رہے تھے۔۔۔ ایک دو بوڑھے حقے کے ساتھ شغل کر رہے تھے۔

مجھے شام کے وقت ہی کسی نے بتا دیا تھا کہ میری بیوی کہاں ہوگی۔

میں چاہتا تھا کہ سب لوگ سو جائیں تو اٹھ کر جاؤں۔۔۔ اسی انتظار میں تین ساڑھے تین بج گئے۔

میں آہستہ آہستہ اس کمرے کیطرف گیا جہاں وہ نیک بخت تھی ۔۔۔ ایک بلی میرے آگے سے پھنکار سا مارتی ہوئی گذری ۔۔۔ میں تھوڑا اچھل پڑا کمرے کا دروازہ کچھ کھلا ہوا تھا ۔۔۔۔ لالٹین کی بتی نیچے کر رکھی تھی ۔۔۔ میں نے آہستہ سے بتی اوپر کی اور اس روشنی میں دیکھا کہ میری بیوی چارپائی پر لیٹی ہوئی سو رہی تھی۔ چہرہ کھلا تھا اور پسینہ آرہا تھا۔۔۔۔ میں نے دھیمی آواز میں بلایا کوئی جواب نہ تھا۔۔۔ میں نے ذرا سا ہلایا۔۔۔۔ وہ گہری نیند میں تھی

میں نے پھر زور زور سے ہلایا اور کان کے پاس آواز دی۔

کہنے لگی "کیا بات ہے"؟

میں نے کہا "اٹھ کر بیٹھ"

کہنے لگی "کیا کام ہے"؟

میں نے کہا" کہ تم عجیب ہو "۔۔۔۔۔۔ پھر ذرا غصے سے مگر دھیمی آواز میں کہا "اٹھ کر بیٹھ"

آنکھیں مسلتی ہوئی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی ۔۔۔ پھر کہنے لگی ۔۔۔۔۔ بتاؤ کیا ہے؟ میں نے کہا "میری تمہارے ساتھ شادی ہوئی ہے"

فوراً کہنے لگی "مجھے پتہ ہے"

میں نے کہا تمہیں گھونگھٹ نکال کر بیٹھنا چاہیے تھا اور میرا انتظار کرنا چاہیے تھا ...... اور اب میں تم سے بات کر رہا ہوں۔ سنو

کہنے لگی "سن رہی ہوں ..... اب بات بتاؤ کیا ہے"۔ اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔

میں نے کہا "میں ایک دو ایسے لگاؤں گا ... بیوقوفی کی باتیں کر رہی ہے ..... یہ ہماری شادی کی پہلی رات ہے۔

کوئی بات کرو ..... یا ..... میری بات خاموشی سے سنو"

اس نے آنکھیں کھول لیں اور جل کر کہنے لگی ... "سناؤ"

"میرا چاچا (والد) بہت غصے والا ہے" میں نے کہا۔

کہنے لگی "مجھے پتہ ہے۔"

"میری بے بے (والدہ) کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ مجھے اس سے بڑا پیار ہے" میں نے کہا۔

کہنے لگی

"مجھے یہ بھی پتہ ہے"

"گھر میں سب کے ساتھ میل ملاپ سے رہنا" میں نے کہا۔ کہنے لگی

"میں کوئی بچہ" "نہیں یہ سب باتیں مجھے پتہ ہیں"

میں نے کہا "بکواس بند کر ..... چپ کر کے سن، جو کچھ میں بکواس کر رہا ہوں" یہ سن کر ہنسنے لگی۔

میں نے کہا "بیوقوفی کی باتیں کرتی ہے پھر اوپر سے ہنستی ہے ابھی دو چار لگاؤں گا تو ٹھیک ہو جائے گی"

اونچی آواز میں کہنے لگی

"مار کر دیکھو میں ابھی چاچا کو آواز دیکر بلالوں گی"

میں نے غصے میں کہا "بندی خدا یہ ہاتھ جوڑتا ہوں آواز نیچی رکھ" وہ چہرے سے پسینہ پونچھ کر پھر اسی طرح لیٹ گئی۔

باہر صحن میں ایک دو کے چلنے کی آواز آنے لگی اور مرغے اذانیں دے رہے تھے میں نے لالٹین کی بتی پھر نیچی کر دی۔

میری خواہش پر

"جانی تم پھر سو رہے ہو .... کچھ باتیں کرلو..... جانی مجھے معاف کردو، بار بار جگانے سے تمہیں غصہ تو آرہا ہوگا..... مجھے معلوم ہے کہ تھکے ہوئے ہو گے، جہاز میں جاکر سوجانا" میں ہلکی نیند میں تھا اور وہ یہ سب کچھ کہتی جارہی تھیں پھر لیٹے لیٹے انارکلی نے چوڑیوں کی کھنک کے ساتھ میرے چہرے کے ایک طرف ہاتھ رکھ کر کسی قدر سختی سے اپنی طرف کرلیا۔

"اوں ہونہہ..... کیا بکواس ہے" میں نے غنودگی میں کہا

"ہائے نخرہ..... کیسی تکلیف ہوئی" وہ بولیں۔

"بھئی تم..... کیا آرام سے سو نہیں سکتیں" میں نے کچھ چڑ کر کہا۔

"اچھا جاؤ ایک گلاس پانی لے آؤ" میں نے فرمائش کی۔

"لاتی ہوں" وہ خوشی سے اچھل پڑیں، اسے تو مجھے جگائے رکھنے میں دلچسپی تھی۔ اس نے لگاتار کی چھیڑ چھاڑ سے مجھے گہری نیند سے جگالیا۔

"ذرا کھلے دروازے سے دیکھتے رہیں۔ مجھے صحن میں جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے" وہ کہنے لگیں۔

چوکیدار کی اچانک سیٹی سے مجھے جھٹکا سا لگا۔ وہ "اوئی اللہ" کی چیخ سی مار کر میرے اوپر گریں اور دیر تک ہنستی رہیں۔ میں انہیں خاموش رہنے کے لئے کہتا رہا اور کہا کہ سب گھر والے سوئے ہوئے ہیں۔ خاص طور پر والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔

"اچھا بابا لیکچر نہ دیں" کہنے لگیں..... اس کے بعد وہ تقریبا دوڑتی ہوئی پانی کا گلاس لے آئیں اور میرا بچا ہوا پانی پی گئیں۔

"کھڑکی کے اوپر کا حصہ جو کہ کھلا ہوا ہے، بند کردو، چاہو تو پنکھا کھول دو" میں نے کہا۔

اس نے پنکھا چلادیا اصل میں اگلے روز صبح ساڑھے دس کی فلائیٹ پر مجھے انگلینڈ روانہ ہونا

تھا۔ ہماری شادی کو صرف آٹھ ماہ ہوئے تھے۔ ہمارے جذبات ایک دوسرے کے لئے خوشگوار تھے زندگی کی ضروریات، گھریلو ماحول اور معاشی مجبوریاں ایک الگ بات تھی۔ تھوڑی بہت سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان جب قناعت پسندی اور جدوجہد میں سے کسی ایک چیز کا چناؤ کرتا ہے۔ تو اس میں فیصلہ تو انسان خود ہی کرتا ہے مگر اس فیصلہ پر اس کے قریبی تعلق داروں کا عمل دخل بھی اثرانداز ہوتا ہے۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے اور اس قیمتی وقت سے جنسی فائدہ بھی اٹھاتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد محترمہ گہری نیند میں تھیں۔

میں خیالات کے ہزاروں تانے بانے بنتا رہا۔ ان چند سالوں میں بھٹکتا رہا جو نہایت کسمپرسی کی حالت میں گزرے اور مالی پریشانیاں دیکھیں، شروع جوانی کے بے ربط رومانس اور جوانی کی سرکشی کے صفحے الٹ پلٹ کرتا رہا۔۔۔۔۔ خیالات سے واپس آیا، تو انارکلی ابھی بھی گہری نیند میں تھیں۔

اس کے ریشمی اور عطر میں لپٹے ہوئے کپڑوں سے جو تپش آرہی تھی، اب بری نہیں لگ رہی تھی صبح ہونے کی وجہ سے اب کمرے میں خوشگوار خنکی تھی۔ میں نے اٹھ کر پنکھا بند کر دیا۔ گھڑی میں تقریباً پانچ بج رہے تھے۔ میں پھر لیٹ گیا۔ روشندان سے ہلکی سی روشنی آرہی تھی۔ سڑک پر کبھی کبھی کسی کے چلنے کی آواز آجاتی تھی۔ میں نے کروٹ لی، میرے ہونٹ اس کے گرم گال سے ٹکرائے تو میں نے دو تین مرتبہ اس کو بچوں کی طرح چوما۔ اس نے بغیر آنکھیں کھولے اپنا ایک بازو میرے بازو کے نیچے سے گزار کر میری پیٹھ پر چٹکی لی۔ میں تھوڑا سا اچھلا۔ یہ اس کی محبت کا محبوبانہ انداز تھا۔ کبھی کبھی اس قسم کی چھیڑ چھاڑ سے میں چڑ جاتا، تو وہ خوب ہنستی تھی، مگر آج کل ان شوخیوں میں وہ شدت نہ تھی۔

اس نے سہاگ رات سے ہی مجھے جانی کہنا شروع کر دیا تھا مگر دوسروں کے سامنے اس نام سے بلانے کے معاملے میں کافی محتاط تھی میں نے کبھی اسے انارکلی نہیں کہا مگر اس افسانے میں اس کا یہ نام مجھے موزوں لگتا ہے۔ شادی کے بعد کے واقعات مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔

دعوت ولیمہ کے متعلق میں نے والد اور والدہ کو بتلایا کہ کیونکہ میرے دوست اور دوسرے قریبی ملنے والے اس شہر میں برائے نام ہیں۔ اس لئے میں اپنے کسی ملنے والے یا دوست کو

ولیمہ پر نہیں بلا رہا میرا اپنا خیال یہ ہے کہ صرف رشتہ داروں کو دعوت ولیمہ پر بلایا جائے

والد اور والدہ نے اس بات پر اتفاق کیا اور کہا "ہمارے جو ملنے والے ہیں ہم ان کے گھر کھانا بھجوا دیں گے۔ اس طرح پردے وردے کے چکر سے بچے رہیں گے۔

میں نے فوٹوگرافر اور کھانے کے انتظامات کے لئے، برتنوں، میزوں کرسیوں اور پکانے والوں کا آرڈر کر دیا۔ دوپہر کو گانے بجانے کا شور کم ہوا تو شام کو دعوت ولیمہ کی تیاریاں نظر آنے لگیں۔

بڑی بہن اپنے خاوند کے ساتھ کسی بحث و تکرار کی وجہ سے گروپ فوٹو میں شامل نہ ہو سکیں نہ ہی ان کے خاوند شامل ہوئے وقتی طور پر ماحول ناخوشگوار ہو گیا۔ مگر شام تک اس ناخوشگواری کے اثرات آہستہ آہستہ زائل ہو گئے۔ دعوت ولیمہ کی تیاریاں نظر آنے لگیں۔ مہمان آنے لگے۔ مختصر سی کرسیاں میزیں لگنے لگیں۔ ہر کوئی ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے لگا۔ صحن کی بتیاں بھی جل گئیں۔ کمرے کے اندر سے میرے لئے انار کلی کا بلاوا آیا۔ میں نے وہاں جا کر دیکھا کہ انار کلی نے میری خواہش پر گوٹے کناری کی شلوار قمیض کے بجائے فیروزی رنگ کی سادہ ساڑھی پہنی تھی جس پر سفید ریشم سے پھول کڑھے ہوئے تھے گہرے رنگ کی سرخی اور ہلکا پھلکا زیور پہنا تھا" ٹھیک ہے "وہ بولیں، پھر کہنے لگیں "جانی میرے ساتھ باہر نکلیں" کسی نے اعلان کیا کہ "ارشد کی خواہش ہے کہ تمام جوڑے خواہ وہ بوڑھے ہوں یا جوان ازراہ کرم میاں بیوی ساتھ ساتھ بیٹھیں" شروع شروع میں تو کچھ بزرگ پریشان سے ہو گئے مگر پھر یہ خیال قبول کر لیا گیا بلکہ بعد میں اس خیال کی تعریف ہوئی۔ جب میں انار کلی کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکلا تو کچھ لوگوں نے تالیاں بجائیں ہم دونوں ایک ساتھ دو خالی پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مجھے ساتھ بیٹھے جوڑے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ کھانا شروع ہوا تو مہمانوں کی تفریح کے لئے میں نے ایک قدم اور اٹھایا زردہ کی پلیٹ اٹھا کر ایک دو چمچ انار کلی کو اپنے ہاتھ سے کھلائے ..... بزرگ اور جوان جوڑوں کے درمیان بیٹھ کر، اتنے بچوں کے سامنے ایسی حرکت کرنے کے لئے خاصی ہمت چاہیے تھی مگر مجھے شو آف کرنے اور ڈرامہ کا ہمیشہ سے شوق تھا خاص طور پر جب کوئی بد تہذیبی یا بد اخلاقی کا پہلو نہ نکلتا ہو۔ اگلے روز ٹیکسی مری روڈ سے صدر کی طرف بھاگ رہی تھی۔ انار کلی نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ وہ میرے ساتھ چپک کر بیٹھی ہوئی تھی۔ "تھوڑا فاصلے پر بیٹھو" میں نے کہا۔ کہنے لگیں "اوہ کچھ نہیں ہوتا" میرے اصرار پر کہنے لگیں

...... "مجھے نہیں پتہ، میں بس ٹھیک ہوں، کوئی دیکھتا ہے تو دیکھے، بکتا ہے تو بکے ...... ہم کوئی بھاگے ہوئے تو نہیں" تھوڑے سے وقفے کے بعد پھر کہنے لگیں "جانی ویسے تم ہو بڑے وہ، کیا کہنا چاہتی تھی ...... میرا مطلب ہے ...... مجھے یا آپ کو پہلے ممانی سے باہر آنے کی اجازت لینی چاہئے تھی" (والدہ ممانی کہتی تھی) "چلتے وقت میں نے انہیں بتا تو دیا تھا" میں نے کہا۔ "میں نے کہا۔" مگر ممانی کے چہرے پر غصہ تھا۔ ہم دونوں نے کچھ غلط کیا" وہ میری سوچ کو کریدنا چاہتی تھی مگر میں خاموش رہا۔ "مجھے واپس جاتے ہوئے ان سے ڈر لگے گا۔ ان کے سامنے جاتے ہوئے ہمت نہ ہوگی" وہ کہنے لگی۔ "سیدھا جانا ہے صاحب؟" ٹیکسی والے نے چوک آنے سے پہلے پوچھا "اگلی ٹریفک لائٹ پر دائیں طرف موڑ لینا اور ہمیں سیروز کے پاس اتار دینا" ٹیکسی والا خاموش رہا جس کا مطلب تھا کہ وہ سمجھ گیا ہے۔ ٹیکسی سے اترنے کے بعد ہم دونوں وہاں ایک کپڑے کی دکان پر گئے اور انارکلی کے لئے دو تین کاٹن کے سوٹ کا کپڑا لیا۔ نزدیک ہی سلنے کے لئے دے دیا۔ واپس جب گھر پہنچے۔ چھوٹی بہن نے دبی زبان میں کہا "والدہ اس قدم پر خوش نہیں ہیں" کہہ رہی تھیں "ہمارے خاندان میں نئے شادی شدہ جوڑے شادی سے تیسرے روز، اس طرح شاپنگ کرنے نہیں جاتے ...... کپڑا وغیرہ میں خود منگوا دیتی، اتنی جلدی سوتی کپڑوں کی کیا ضرورت تھی" تیسرے دن محلے کی عورتوں کا، بہنوں اور ان کے بچوں کا ہنگامہ سا رہا۔ انارکلی ایک گلابی سلکی سوٹ جو کہ گوٹے کناری وغیرہ سے سجایا گیا تھا پہن رکھا تھا۔ پورا میک اپ اور زیور بھی پہنے ہوئے تھے۔ گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھیں کبھی کبھی شوخی سے اور نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھتیں، بچے اور بڑی لڑکیاں کبھی کبھی اونچی تانوں میں رک رک کر اپنے پسندیدہ گانے گا رہے تھے۔ میں انارکلی کے قریب ہی فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ والدہ بھی وہیں بیٹھی تھیں۔ آہستہ آہستہ مجھے سمجھا رہی تھیں "بس تم اسے یہ سمجھا دو، جہاں میں اس کو کھڑی کروں، کھڑی ہو جائے، جہاں میں بٹھاؤں، وہاں بیٹھ جائے، میرے حکم اور کہنے پر چلے گی، تو ہمیشہ سکھی رہو گے اور یہ لڑکی ٹھیک رہے گی" وہ بیشک دوراندیش اور تجربہ کار تھیں۔ مگر مجھے، بچپن سے ہی سسرال کی ناانصافیوں کے قصے سنا کر والدہ نے میرے دل میں یہ بات پوری طرح بٹھا دی تھی۔ کہ کوئی ساس اپنی بہو کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتی۔ میں نے فوراً ایک انصاف پسند خاوند کی حیثیت سے سوچا۔ "اب وہ میری ماں نہیں ہیں۔ ان کے اندر ایک عورت

اور ایک ساس بول رہی ہے۔ وہ تمام عمر اپنی سسرال کی زیادتیوں کا ذکر کرتی رہی تھیں۔ اب وہی لباس وہ خود پہنے کھڑی ہیں۔ جو کبھی ان کی ساس نے پہن رکھا تھا۔ ان کی ایسی حاکمانہ خواہشات کا سن کر میرا دل کچھ بیٹھ سا گیا۔ چند لمحوں کے لئے میں افسردہ سا ہو گیا۔ خوشیاں ہمیں مفت میں نہیں ملتیں، جو خوشیاں اور محبت مجھے ان سے ملی تھیں۔ اب اس کی قیمت ادا کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ زندگی کے کچھ تلخ حقائق داخل ہونے والے تھے۔ میں زندگی کے اس موڑ پر گہری سوچ میں تھا۔ آٹھ ماہ کے بعد مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس دوران بے شک کچھ دلچسپ اور خوبصورت لمحات تو گزرے مگر کچھ تلخیوں اور آنسوؤں کے جذباتی ڈرامے بھی ہوئے ازدواجی زندگی کے تجربہ سے کئی ایک باتیں ایسی سامنے آئیں۔ جن کے متعلق میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ میں اب تک اپنی عقل وشعور پر بہت نازاں تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ جذباتی ہونے کی وجہ سے انسانی فطرت کے کچھ پہلوؤں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس لئے گھریلو بحث مباحثے سے جلد پریشان ہو جاتا والد صاحب کو مجھ سے بے پناہ محبت تھی۔ میں بھی ان کا احترام کرتا اور ان سے کافی لگاؤ تھا مگر ان میں بزرگانہ سنجیدگی اور تحمل مزاجی کا فقدان تھا۔ وہ ہر چھوٹے بڑے سے، بحث میں الجھ جاتے تھے والدہ کی عادات اس معاملہ میں مختلف تھیں۔ وہ سنجیدہ تھیں۔ بحث و تکرار سے پریشان ہو جاتی تھیں۔ والد صاحب کی بحث و تکرار سے سب بیزار تھے۔ مجھے گھریلو جھگڑوں سے سخت نفرت تھی۔ میں ناتجربہ کار اور حساس ہونے کی وجہ سے گھر کو جنت بنانے میں ناکام رہا۔ انہی حالات نے مجھے غیر ملک جانے پر اکسایا۔ میں نے سوچا، باہر جانے کا کم سے کم ایک یہ تو فائدہ ہو گا کہ میں سب گھر والوں کے درمیان، ٹینس کا گیند بننے سے تو بچ جاؤں گا۔ "میں اپنے خیالات میں تھا کہ انار کلی بولیں "جانی تم جاگ رہے ہو، سوئے نہیں ـــــ جانی بھائی جان کہہ رہے تھے چہروں کی رونقیں کافی نہیں ہوتیں۔ جانی انگلینڈ جا کر خوب پیسے کما کر لانا، پھر ایک بڑی سی کوٹھی بنانا ـــــ اور میرے لئے بہت سا زیور بنانا"

نو بجنے میں ابھی چند منٹ باقی تھے، پچیس تیس رشتہ دار جن میں میرے ماں باپ، بیوی اور چھوٹی بہنیں شامل تھیں۔ اپنی اپنی کاروں یا ٹیکسیوں پر روانہ ہوئے گاڑیاں چکلالہ روڈ پر اچھل کود کرتی ہوئی ائیر پورٹ کی طرف جا رہی تھیں۔ اس وقت ان سب کا خلوص و محبت کچھ اس قسم کا تھا۔ جیسے کہ میری ان لوگوں سے آخری ملاقات تھی۔ اس طرح کے تصور سے غیر ملک جانے کی خوشی کچھ مدھم

پڑگئی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ میری خوشی سے نہیں ہو رہا تھا میں نے گہری سوچ میں محسوس کیا۔ جیسے بہت بڑے طوفان میں انار کلی کی آوازیں آرہی ہیں اور وہ چلا چلا کر کہہ رہی تھی ۔۔۔ جانی ۔۔۔۔ انگلینڈ جا کر خوب پیسے کما کر لانا ۔ پھر ایک بڑی سی کوٹھی بنانا ۔۔۔ اور میرے لئے بہت سازیور بنانا" انہی آوازوں میں کبھی کبھی والدہ کی آواز آتی تھی "جہاں میں بٹھاؤں ۔ بیٹھ جائے جہاں کھڑی کروں کھڑی ہو جائے ۔ تو تم ہمیشہ خوش رہو گے" جب ساڑھے دس بجے بوئینگ رن وے پر رینگنے لگا تو جیٹ کی کھڑکیوں سے مجھے ہزاروں لوگ ہاتھ ہلاتے ہوئے نظر آئے مگر اتنے بڑے ہجوم میں اپنے گھر والوں کو پہچاننا مشکل تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ان سب کے لئے میرے دل کا حال جاننا مشکل تھا ان میں شاید ہی کوئی ایسا تھا جسے معلوم ہو کہ مجھے ٹینس کا گیند بننا پسند نہ تھا۔

سڑک کے درمیان

"اس کے اندر کیا بھرا ہوا تھا؟ ...... لگتا تھا کہ گوشت پوست کا نہیں، کسی اور چیز کا بنا ہوا تھا۔ کسی تھکے ہوئے شیر کی طرح جب وہ چلتا تو اس کی چال میں بڑی عظمت اور وقار جھلکتا تھا۔ جہاں سے گزرتا، لوگ انجانے میں اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھنے لگتے تھے۔ اپنے اطراف سے بے نیاز بس چلتا جاتا تھا۔ ہر لباس اس کو ایسا زیب دیتا تھا کہ کپڑے کا رنگ، اس کی کاٹ اور موزونیت تو تھی ہی مگر پہننے کا سلیقہ بھی تھا عمر پچپن سے اوپر ہی لگتی تھی۔ بڑا مناسب قد اور کاٹھی بڑی عمدہ تھی، پیشانی، ناک نقشہ اور چہرے کا توازن ایک خاندانی رئیس یا کسی بڑے افسر ہونے کا احساس دلاتا تھا آنکھوں میں ایسی چمک اور تیزی کہ ان میں دیکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں وہ گم سم سا رہنے لگا تھا۔ لگتا تھا اسے اندر سے کوئی چیز کھائے جا رہی تھی۔ اس کو کیا غم تھا؟ کیا پریشانی یا بیماری تھی؟ کسی کو بھی پتہ نہیں تھا لوگ بس ویسے ہی اندازے لگاتے تھے۔ کوئی کہتا تھا "اس پر غبن کا مقدمہ تھا۔ اس لئے حکومت نے اسے معطل کر دیا تھا۔"

ایک صاحب کہنے لگے۔ "اس کے تین لڑکے کار کے حادثے میں مر گئے تھے۔"

ایک نے منفی انداز میں گردن ہلائی جیسے کہ یہ راز صرف اسی کے پاس ہے سرگوشی میں کہنے لگا۔ "اس شخص کی بیوی نے سب کچھ اپنے نام کروا لیا ہے اور اس کا تمام پیسہ اپنے رشتہ داروں کو کھلا دیا ہے۔"

ایک دن ایک صاحب سائیکل لئے کسی دکان پر کھڑے تھے۔ دیکھنے میں تو کوئی ٹٹ پونجیے نظر آرہے تھے۔ مگر ان کا دعویٰ تھا کہ وہ ان صاحب کے چچا زاد بھائی تھے اور یہ کہ ان کے بھائی کو کوئی خاص غم یا پریشانی نہیں تھی۔ بس کم گو تھے میں یہ سب باتیں خاموشی سے سنتا رہتا۔ دراصل میں نے پہلی بار صاحب کو ایک سرکاری دفتر میں دیکھا تھا۔ جو ایک وسیع کوٹھی میں تھا۔ چار ہفتے

تک میں اس دفتر کے چکر کاٹتا رہا مگر ہماری زمینوں کے معاوضوں کے متعلق کچھ پتہ نہ تھا۔ دفتر کا ہر کلرک لاعلمی کا اظہار کرتا تھا۔ ان لوگوں کے غیر ہمدردانہ رویے اور اپنی ناتجربہ کاری پر گھنٹوں وہاں ماتم کرتا تھا۔ کوئی راستہ سمجھ نہیں آتا تھا۔ ایک گھٹن سی محسوس ہوتی تھی ایک روز اس دفتر میں عام دنوں سے زیادہ چہل پہل تھی۔ باہر بہت سی نئی پرانی اور چھوٹی بڑی کاریں کھڑی تھیں لان اور برآمدے میں کافی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ مارچ کا مہینہ تھا۔ دھوپ میں گرمی کی اتنی شدت اور چمک نہ تھی ...... دھوپ میں ٹہلتے ہوئے آج میں نے طے کر لیا تھا۔ کہ صاحب سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔

اچانک لوگوں میں کچھ ہل چل سی پیدا ہو گئی۔ میں نے دیکھا تو ایک لمبی کالے رنگ کی کار آہستہ آہستہ کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ میں تیزی سے کوٹھی کے برآمدے میں پہنچ گیا اور ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں صاحب کے دفتر کا دروازہ تھا جذبات سے مغلوب ہو کر میرے جسم میں ایک تناؤ سا پیدا ہو گیا۔ جب صاحب، افسروں اور خوشامدیوں کے ریلے میں برآمدے کی طرف آیا میں نے آگے بڑھ کر تقریباً اس کا راستہ روک لیا۔

"مم مم میں چار ہفتے سے یہاں کئی گھنٹے" ...... میں نے ہکلا کر صاحب سے کوئی بات کرنی چاہی۔

"جیبوں سے اپنے ہاتھ باہر نکالو" ... صاحب نے میری بات درمیان میں کاٹ کر مجھے کسی سارجنٹ میجر کی طرح ڈانٹا۔ میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ پتلون کی جیبوں سے اپنے ہاتھ باہر نکالے اور ایڑھیاں جوڑ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"اب بات کرو" صاحب نے کہا۔

"جی میں اپنے والد کی زمینوں" ...... میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ صاحب نے پھر میری بات کو کاٹ دیا۔

"مجھ سے کیا کہتے ہو دفتر سے معلوم کرو" یہ کہہ کر صاحب چند سہمے ہوئے ضرورتمندوں میں سے گزرتا ہوا دو چار خوشامدیوں کے ساتھ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

میں اور والد صاحب تین چار روز تک یہاں آتے جاتے رہے مگر زمین کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ میرے والد صاحب نے جب اس دفتر کے کلرکوں سے زمینوں کی ادائیگی نہ ہونے کے

متعلق غصہ کیا تو ہیڈ کلرک نے کہا "کہ صاحب کے پاس پیش ہو جائیں ہم کچھ نہیں کر سکتے"
صاحب کے ملاقاتیوں کا زور کم ہوا تو والد صاحب کو برآمدے میں بٹھا کر میں چپڑاسی کے پاس گیا۔ اس نے مجھے صاحب کے دفتر میں جانے دیا۔
جب میں چق اٹھا کر اندر داخل ہوا تو صاحب نے رعب دار آواز میں پوچھا
"یس ---- کیا چاہتے ہو"..........
مجھے صاحب کا مغرورانہ انداز کچھ اچھا نہ لگا۔ میرا ضمیر جاگا اور ملاقات کے خوشامدانہ طریقے کا جو پروگرام بنایا تھا سب غائب ہو گیا۔ میں نے سلام تک نہ کیا
صاحب "یس" کہنے کے بعد میری طرف دیکھے بغیر کچھ لکھتا رہا۔
میرے جس دماغ کے حصہ نے مجھے خوشامدانہ رویہ کا مشورہ دیا تھا۔ اندر سے سرگوشی کی "ابے کام کروانا ہے یا نہیں پھنے خاں بننے کا کوئی فائدہ نہ ہو گا خوشامد ہی کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے۔ اس طرح کے دفتروں میں کام لینے کے لئے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہو گا۔"
اتنا وقت گزرنے کے بعد اب سلام کرنا بے کار تھا مگر میں صاحب کے لئے اپنے چہرے پر احترام کے تاثرات لانے کی کوشش کرنے لگا اور نپے تلے فقرے سوچنے لگا۔
چق اٹھا کر ہیڈ کلرک چند فائلیں لئے اندر آیا اس کے پیچھے ایک اور کلرک تھا تو ہیڈ کلرک نے اسے آنکھ کے اشارے سے واپس کر دیا۔ ہیڈ کلرک اپنی فائلیں لئے پہلو سے بدلنے لگا۔ پھر جب صاحب نے دیکھا تو فائلوں کے اوپر سے کچھ کاغذات اٹھا کر صاحب کے آگے کر دیئے۔ صاحب ان کاغذات کو دیکھ کر دستخط کرتا گیا اور ہیڈ کلرک دستخط شدہ کاغذات ایک ایک کر کے اٹھاتا گیا۔
تین آدمی اندر داخل ہوئے۔ دو شلوار قمیض والوں نے دونوں ہاتھ بڑھا کر اور جھک کر صاحب کیساتھ مصافحہ کیا تیسرے صاحب جو انگریزی لباس میں تھے اپنا داہنا ہاتھ سر تک لے گئے صاحب نے سرسری طور پر میری طرف دیکھا پھر ان لوگوں کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کی اجازت دی۔ ہیڈ کلرک نے ایک بند لفافہ صاحب کے آگے رکھ کر ایک شلوار قمیض والے صاحب کی طرف اشارہ کیا "یہ وہ صاحب ہیں جن کی زمینوں کی ادائیگی کا ذکر میں نے کیا تھا۔"
"اچھا اچھا" کہہ کر صاحب نے لفافہ اپنی دراز میں ڈال دیا اور مسکرا کر ایک کاغذ اور ایک

چیک پر دستخط کر دیئے۔ اچانک صاحب کو کھانسی ایسی زور دار آئی کہ کھانستا ہی چلا گیا اور سانس کچھ عجیب سا ہو گیا۔

ہیڈ کلرک نے اپنی فائلیں میز پر رکھیں۔ جلدی سے پانی کے جگ اور گلاس کی طرف دوڑا جو ایک طرف چھوٹی میز پر رکھے تھے۔ صاحب کے سامنے بیٹھے ہوئے اصحاب بھی جلدی سے کھڑے ہو گئے اور ہیڈ کلرک کے پیچھے پیچھے مدد کے لئے گئے ایک صاحب نے صراحی اٹھا کر شیشے کے گلاس میں پانی انڈیلا جسے ہیڈ کلرک نے دونوں ہاتھوں سے پکڑا ہوا تھا دو تین گھونٹ صاحب کے حلق سے اترے تو صاحب کا سانس ٹھیک ہوا۔ ایک نوجوان ٹائپسٹ سہما ہوا صاحب کے پاس آکر کھڑا ہو گیا صاحب نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر کاغذات اس سے کھینچ لئے۔ صاحب اپنا قلم میز پر بکھرے ہوئے کاغذات میں تلاش کرنے لگا۔ تو ٹائپسٹ نے ڈرتے ڈرتے اپنا قلم آگے بڑھا دیا۔ صاحب نے قلم لے کر ٹائپ شدہ کاغذات پڑھے اور دستخط کر دیئے۔ ٹائپسٹ کاغذات لینے کے بعد بھی وہیں کھڑا رہا۔ صاحب نے پہلے تو غصے اور تعجب کے ملے جلے جذبات سے ٹائپسٹ کو دیکھا۔ اور کاغذوں پر پڑا ہوا قلم اٹھا کر بڑی حقارت سے اس کو دے دیا۔

صاحب نے دانت پیستے ہوئے انگریزی میں آہستہ سے کہا "تم لوگ کبھی نہیں سیکھو گے۔"

ٹائپسٹ اور ہیڈ کلرک کے جانے کے بعد سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کے ساتھ صاحب خوش دلی کی باتیں کرنے لگا۔

اس گفتگو کے دوران صاحب کاغذات کو الٹ پلٹ کر کے کچھ تلاش کر رہا تھا اور ایک کاغذ کو پڑھ بھی رہا تھا۔ ایک سرکاری قلم اٹھا کر ایک کاغذ پر کچھ لکھنا چاہا تو شاید قلم صحیح نہیں چلا تو اسے قلم دان پر رکھ دیا۔

"میں نے اپنا قلم کہاں رکھ دیا ہے؟" صاحب نے کاغذوں میں اپنا قلم تلاش کرتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

کوٹ پتلون والے آدمی نے اپنا سنہری قلم ان کے آگے بڑھا دیا۔

صاحب نے "شکریہ" کہتے ہوئے اس قلم سے کچھ لکھا اور پھر واپس دینا چاہا

"سر آپ دکھیں میرے پاس بالکل ایسا ہی اور ہے۔"

شاید یہ معمولی تحفہ صاحب اس سے نہیں لینا چاہتا تھا۔ قلم کے واپس کرنے کی بحث و تکرار میں قلم صاحب کے ہاتھ سے گر پڑا۔ شلوار قمیض والے صاحبان تقریباً میز کے نیچے گھس گئے۔ قلم تلاش کرنے لگے۔ کوٹ پتلون والے صاحب بھی پوری کوشش میں تھے کہ ان کا قلم اس طرح ضائع نہیں ہونا چاہیے آخر کافی تگ و دو کے بعد معلوم ہوا کہ وہ صاحب کی میز پر ہی کاغذات میں الجھ گیا تھا۔ صاحب نے کوٹ پتلون والے صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، سنہری قلم اپنی جیب میں لگا لیا۔

والد صاحب باہر انتظار کرتے کرتے کچھ فکر مند ہوئے۔ دروازے پر لٹکی ہوئی چق اٹھا کر میری طرف دیکھا، اپنی بھنووں اور ہاتھ کے اشارے سے پوچھنے لگے "کہ کیا ہوا؟"

میں صاحب کے سامنے کھڑا اتنی دور سے کیا جواب دے سکتا تھا۔

میرا کوئی جواب نہ پا کر والد صاحب اندر آگئے۔ مجھے گھبراہٹ ہوئی کہ اب کوئی کام ہوتا بھی ہوگا۔ تو وہ بھی بگڑ جائے گا۔ کیونکہ وہ بہت جذباتی تھے۔

میں جو اتنی دیر سے چپ چاپ کھڑا تھا جلدی سے والد صاحب کا تعارف کرایا "صاحب یہ میرے والد ہیں، ریٹائر ہو چکے ہیں۔ زمینیں ہی ہماری آمدنی کا واحد ذریعہ تھیں جو حکومت نے لے لی ہیں۔ ہمارے معاوضے جلد ادا کیے جائیں۔ تاکہ ہم اپنا کوئی کاروبار کر سکیں۔ میرے امتحانات نزدیک ہیں اور میرے والد بوڑھے ہیں اور اکثر بیمار رہتے ہیں۔

میں ایک ہی سانس میں اپنی کانپتی ہوئی آواز میں یہ سب کچھ اس لئے کہہ گیا کہ والد صاحب درمیان میں نہ بول پڑیں۔"

"مجھے اپنی پرابلمز (Problems) نہ سناؤ" صاحب میز پر مکہ مارتے ہوئے گرجا۔

والد صاحب کچھ بولنے والے تھے۔ مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں اس مغرور اور بد دماغ افسر کے سامنے منت سماجت نہ کرنے لگیں۔

"آپ ذرا خاموش رہیں" میں نے والد صاحب کو آہستہ سے کہا۔

اب میں بحیثیت انسان کے اپنے حقوق کی بات کرنا چاہتا تھا اور آج جھاڑنے کے موڈ میں تھا۔

وہ جو تین شخص صاحب کے سامنے بیٹھے تھے۔ آہستہ سے سلام کرکے نکل گئے۔

میں بہت جذباتی ہو چکا تھا مگر پھر بھی مین نے دھیمی آواز میں مگر ذرا سختی سے یہ کہا "کیا یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی ہی زمینوں کے معاوضے کے لئے ناجائز ذرائع استعمال کریں اور بند لفافوں کا انتظام کریں"

"وہ تو تم لوگ کرو بھی تو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔" صاحب نے بڑے حاکمانہ انداز میں کہا۔

میں والد صاحب کو سہارا دے کر آہستہ آہستہ باہر لے آیا اور ٹیکسی کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد صاحب کا چپڑاسی دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا "صاحب کہہ رہا ہے کہ پرسوں آکر اپنا (payment) معاوضہ لے جاؤ۔"

اب چند سالوں سے صاحب کو دیکھ رہا تھا کہ آواز میں وہ گرج، کاروں اور نوکروں کی شوشا تو نہیں تھی۔ مگر آنکھوں میں چمک اور ذہانت اسی طرح ٹپکتی تھی۔ ابھی چند ماہ ہوئے دکانوں اور اسی طرف کی کوٹھیوں سے لوگ دوڑے اور ایک شور سا برپا ہوا۔ لوگوں کو دوڑتے دیکھ کر میں بھی دوڑا، وہاں پہنچا تو دیکھا سڑک کے کنارے ایک زخمی کے گرد لوگ جمع تھے قریب جا کر دیکھا تو صاحب نیم بیہوش پڑا تھا۔ سڑک کے درمیان ایک خوبصورت قلم گرا ہوا تھا میں نے یہ قلم اٹھا کر صاحب کی جیب میں احتیاط سے لگا دیا کتنے ہی لوگ چھوٹی بڑی کاروں میں صاحب کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ پاس سے گزر رہے تھے۔ چند غریب مگر پڑھے لکھے نوجوانوں نے صاحب کو سنبھال کر ایک سوزوکی میں لٹایا اور ہسپتال لے گئے۔

جھوٹی شکایت

کسی جوان لڑکے کے لئے اس سے زیادہ شرمندگی کی اور کیا بات ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے سامنے ماں سے پٹے۔ آدھی درجن سے زیادہ جوان لڑکیوں اور بارہ چودہ مختلف عمر کے بچوں میں سے کچھ تو تعجب اور ہمدردی سے دیکھ رہے تھے چند ایک ایسے بھی تھے جو مزاحیہ ڈرامے کا دوسرا سین سمجھ کر ہنس رہے تھے۔

والدہ نے دیوار کے پیچھے سے نکل کر کچھ ایسا اچانک اور شدید حملہ کیا کہ میرے لئے کسی بزدل باکسر کی طرح دونوں بازوؤں سے سر اور چہرہ چھپانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ان کی مضبوط کلائیاں اور ربڑ کی چپل جب ایکشن میں ہوں تو اس وقت کوئی حیلہ بہانہ کارگر نہیں ہوتا۔ اس لئے میں نے پھلانگ کر دیوار پر چڑھنا ہی مناسب سمجھا جہاں ان کی رسائی مشکل تھی۔ میں نے مزاحیہ حرکات وسکنات سے انہیں ہنسانا چاہا مگر پھر بھی ان کے چہرے پر غصہ اور افسوس جھلک رہا تھا سارا جھگڑا اس بات پر تھا کہ میں فطرتاً اچھل کود کا شائق اور خطروں سے بے بہرہ..... اور ان کی فطرت میں ماں کی ممتا وسوسے اور ڈر..... گو کہ ایک دو گھنٹے کے بعد بھی مجھے ان بچوں پر سخت غصہ آ رہا تھا جنہوں نے میری شکایت کی اور میری پٹائی پر ہنس رہے تھے مگر یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں نے کتنی بڑی حماقت کی تھی اپنی زندگی کو اتنا ارزاں سمجھنا بہادری نہیں بیوقوفی ہے۔ ماں کی مار پیٹ اکثر اوقات اس کی انتہائی محبت کا ردعمل ہوتا ہے کیونکہ باپ کی نسبت بچوں سے ماں کا زیادہ واسطہ پڑتا ہے۔ اس لئے وہ ڈسپلن اور تربیت کے لئے نصیحت اور کئی نرم طریقے ان پر آزماتی ہے۔ مگر جب معاملہ بالکل ہاتھ سے نکل جائے یا برداشت سے باہر ہو تو مار پیٹ سے دریغ نہیں کرتی۔ اپنی تخلیق کو بہتر سے بہتر اور خطروں سے محفوظ دیکھنا چاہتی ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کو تین چار سال ہوئے تھے

۔پاکستان میں اکثریت مسلمانوں کی تو تھی ہی مقامی و مہاجر کا فرق بھی آہستہ آہستہ مٹ رہا تھا۔ جانی اور مالی قربانیاں دینے والے اپنے غموں کو بھول چکے تھے نئی زندگی، نیا ماحول، نئے ملک کی تعمیر کے جذبے سے سرشار لوگ ہر حال میں خوش تھے فوں فاں کم تھی۔ اگر تھی بھی تو بڑی بھدی اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ 1947ء کے انقلاب سے لوگوں کی مالی حیثیت میں تبدیلیاں تو ضرور آئی تھیں مگر احساس موجود تھا کہ کسی شخص کے بڑا یا چھوٹا ہونے کی پہچان اس کی مالی حیثیت نہیں ہے۔

فوں فاں کے چالاک اور اعلیٰ طریقے اس وقت تک ایجاد نہیں ہوئے تھے نہ ہی سیاسی ریچھ اور ادبی مگرمچھ قابل قبول تھے۔ رشتہ دار دوست واحباب بغیر کسی غرض کے بڑی محبت سے ملتے تھے۔ جس طرح والدین میں کوئی تعصب نہ تھا، نئی پود بھی گلی محلوں میں کھیل کود کا ایک شور برپا رکھتی تھی۔ نہ کبھی سر پھٹتے اور نہ ہی گولیاں چلتی تھیں برتھ کنٹرول کا لیکچر مضحکہ خیز تھا۔ عام سوچ یہی تھی کہ رزق اللہ تعالیٰ دینے والا ہے لوگ جو کہتے اس پر ایمان بھی رکھتے تھے۔ روکھی سوکھی پیٹ بھر کر کھانا سبھی کو مل جاتا تھا۔ خواہ کنبہ چھوٹا تھا یا بڑا۔

کاروباری اور دفتری بابو اپنی سائیکلوں میں ہی مست تھے۔ راولپنڈی کی مری روڈ پر صبح کے وقت سائیکلوں کا ایک دریا سا بہتا نظر آرہا تھا ان میں اکثریت ایسی تھی جو مختلف دفاتر کو جا رہے ہوتے تھے۔ صاف ستھری زرد اور پیلے رنگ کی بسیں رواں دواں رہتی تھیں جن میں بس کنڈکٹر پی کیپ اور خاکی وردی پہنے ہوتے تھے اس وقت تک یہ قومی سہولت عوامی غیض و غضب کا نشانہ نہیں بنی تھی۔ کاریں اور دوسری گاڑیاں برائے نام نظر آتی تھیں۔

شہر کی ہوا میں پٹرول اور ڈیزل کے دھوئیں کی آلودگی کم تھی تانگے والے کی زبان پر شائستگی تھی۔ اسی زمانے میں بہار کے موسم میں پتنگ بازی زوروں پر تھی زیادہ تر اسکول بند تھے۔ امتحانات ختم ہو چکے تھے۔ جہاں ہم لوگ رہ رہے تھے یہ مکان زیادہ بڑا نہ تھا مگر نیا اور مضبوط بنا ہوا تھا۔ اس میں دو تین خاندان رہتے تھے۔ اگر کہیں چھٹی تہوار خوشی یا غمی کے دن کچھ رشتہ دار آجاتے تو اچھا خاصہ ہنگامہ رہتا تھا۔

چھت کافی بڑی تھی دو طرف سے مکان ملے ہوئے تھے۔ مکان کے سامنے کھلا میدان تھا جو بچوں اور بڑوں کے لئے ہر طرح کی دلچسپیوں کا ایک مرکز سا بنا ہوا تھا مکان کے ......

پچھواڑے ایک تنگ گلی تھی۔ اس کے ساتھ جو مکان تھا اس کی پردہ کی دیوار اور چھت ہمارے مکان سے کچھ نیچی تھی۔ اپنی پتنگیں جب کٹ گئیں یا پھٹ گئیں تو میں مکان کے پچھلے حصے کی دیوار پر کھڑا ہو کر کسی کی کٹی ہوئی پتنگ کو دیکھنے لگا۔ ہائے اللہ کی ایک دو آوازیں آئیں میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو میرا توازن بگڑنے ہی والا تھا کہ پھر سنبھل گیا ۔۔۔۔۔۔ سب سے بڑی لڑکیاں اور دوسرے بچے اپنی مصروفیات چھوڑ کر مجھے تکنے لگے۔ میں ذرا شیخی میں آکر اس دیوار پر چلنے لگا میں نے اپنا توازن قائم رکھا۔ بعض رشتہ دار لڑکیاں اور بچے جنہیں اس دیوار کے پیچھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ایک تنگ گلی ہے، پردے کی دیوار کے پاس آکر گلی میں دیکھنے لگے۔ میں اپنے ذہن میں دوسری طرف دیوار کے درمیان کا فاصلہ ناپ رہا تھا کہ ایک لڑکی نے میری اندرونی کیفیت کو بھانپتے ہوئے کہا۔ کیا خودکشی کا ارادہ ہے؟ خودکشی کا تو نہیں دوسری طرف جانے کا خیال ہے میں نے جواب دیا۔۔۔

خالہ ۔۔۔۔۔۔ کسی بچے نے میری والدہ کو آواز دے کر مجھے دھمکی دی ۔۔۔ مگر میں یہ کام اس کی خالہ کے آنے سے پہلے کر لینا چاہتا تھا تین چار بچے والدہ کو بلانے کے لئے ۔۔۔۔۔۔ خالہ ۔۔۔ امی اور امی کی آوازیں دیتے ہوئے جنگلے کی طرف دوڑے جہاں سے مکان کا اندر کا حصہ نظر آتا تھا میں نے چھلانگ لگا دی۔ میرا پہلا پاؤں تو ٹھیک دوسری دیوار پر پڑا ۔۔۔ مگر جب دوسرا پاؤں دیوار پر رکھا تو توازن قائم نہ رکھ سکا ۔۔۔ مگر خوش قسمتی سے یہ بات دماغ میں آگئی کہ توازن قائم کرنے کی کوشش میں گلی کے اندر بیس فٹ کی بلندی سے گرنے کی بجائے سات فٹ کی گہرائی میں گرنا بہتر ہے ۔۔۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر پڑوسیوں کی چھت پر چھلانگ لگا دی ۔۔۔ اس طرف جا کر گرا تو معمولی چوٹ آئی۔ جب میں مختلف چھتوں اور منڈیروں سے ہوتا ہوا واپس اپنی چھت پر پہنچا تو والدہ غصے اور پریشانی کی حالت میں بے تابی سے میرا انتظار کر رہی تھیں جیسے ان کی کئی سال کی محنت برباد ہونے والی تھی۔ مار پیٹ کے بعد بھی چند گھنٹے وہ مجھ سے ناراض رہیں۔ اور نہ کوئی بات کی۔ یہ سزا مار پیٹ سے کہیں زیادہ تکلیف دہ تھی۔ کچھ دنوں کے بعد میں اپنی کتابیں ٹھیک کر رہا تھا تو سمجھانے کے انداز میں کہنے لگیں۔ تمھیں کیا معلوم میں نے کتنی منتیں اور دعائیں مانگ مانگ کر اتنا بڑا کیا ہے۔ کسی مقصد کے لئے جان دو تو شاید سینے پر پتھر رکھ لوں کچھ عرصہ بعد جب میں اپنی ماں کا فرمانبردار بیٹا بن گیا تو چھت کے واقعہ پر موجود لڑکیوں میں سے ایک لڑکی نے میری جھوٹی شکایت کی

مجھے اس سے ذہنی اذیت بھی ہوئی اور پریشانی بھی کیونکہ اس لڑکی نے جو شکوک مجھ پر ظاہر کئے تھے غلط تھے۔ مجھے ڈر ہوا کہ اس سے والدہ کے دل میں میرے متعلق بدگمانی پیدا ہوگی مگر والدہ ان باتوں کو اچھی طرح سمجھتی تھیں۔ انہوں نے اس لڑکی کو یہ جواب دیا "یہ بات تم اس لئے کہہ رہی ہو کہ شاید اس نے تمہاری طرف توجہ نہیں دی۔"

چہرے

نیند میں اونگھتے ہوئے انڈر گراؤنڈ ٹرین میں میری آنکھ کھلی تو میرے سامنے جو تیس پینتیس سالہ انگریز بیٹھا تھا۔ وہ اب نہیں تھا اس کی جگہ شلغم نما چہرہ لئے ایک اور آدمی بیٹھا تھا۔ قومیت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ ایشین یا انگریز نہیں تھا ویسٹ انڈین بھی نہ تھا۔ ڈارک براؤن آنکھیں، رنگ کسی گریک، اٹالین یا ٹرکش کی طرح عمر بتیس چھتیس کے قریب۔ قد مجھ سے یقیناً اونچا تھا یہی کوئی پانچ فٹ دس انچ چہرے پر محنت اور دھوپ کے آثار تھے۔ سر پر بال چھوٹے چھوٹے تھے لباس صاف تھا لیکن جدید نہیں تھا۔ سر پر بال کم ہونے کی وجہ سے کان کچھ آگے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اصل میں یہ سب جائزہ میں نے اسی وقت شروع کیا جب میں نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی وہ میرے دائیں طرف بیٹھی ہوئی انگریز لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکی اچھے قد کی اور گرمیوں کے لباس میں تھی۔ بڑے غور سے کتاب پڑھ رہی تھی میں صرف اس کا ایک ہاتھ دیکھ سکتا تھا۔ ناخنوں پر نیل پالش نہ تھی اور نہ ہی وہ بڑھے ہوئے تھے وہ "نیل بائیٹیر" بھی نہ تھی۔ ناخن صاف ستھرے نفاست سے کٹے ہوئے تھے۔ برابر بیٹھے ہوئے شخص کو گردن گھما کر دیکھنے کے لئے بڑی ہمت چاہیے۔ لہذا اس کے متعلق مزید جائزہ لینے کے لئے جب ٹرین اسٹیشن چھوڑ کر سرنگ میں داخل ہوئی تو میں نے سامنے والے شیشے میں دیکھا۔ شیشے کے پیچھے اندھیرا ہو تو روشنی میں بیٹھے ہوئے ہم سب سامنے نظر آنے لگتے ہیں۔ مگر برابر والی لڑکی کا چہرہ اور اس کے تاثرات اب بھی نظر نہیں آرہے تھے میں نے تھکاوٹ کی وجہ سے سیٹ پر قدرے پہلو بدلا تو میرا بازو پلاسٹک کی ٹیک پر چلا گیا لڑکی کا بازو پہلے ہی وہاں دھرا ہوتا تھا میری کہنی اب اسی کو چھو رہی تھی لیکن اس نے بازو وہیں رکھا۔ اس نے بازو وہاں سے نہ ہٹا کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ مجھ پر بھروسہ کرتی ہے یا کم سے کم اس نے شک ظاہر نہیں کیا تھا۔ اگر کرتی بھی تو مجھے تعجب نہ ہوتا انسان کتنا خود پرست ہے۔ بیشک میں کوئی فرشتہ نہ تھا، مگر یہ بات مجھے پسند آئی بلکہ کسی حد تک ہلکی سی خوشی بھی ہوئی کہ اس نے مجھے شریف سمجھا۔ اس کی درجنوں اور

بھی وجوہات ہو سکتی تھیں مگر میں نے اس وقت ایسا ہی سوچا میں اس کے احسان تلے دب گیا تھا اب اگر وہ مجھے یہ کہتی کہ اپنا پیٹ پھلا کر سانس نہ لو تو شاید اس کے کہنے کا برا نہ مانتا۔ میرے بائیں ہاتھ پر ایک نوجوان انگریز نیوی بلیو سوٹ میں ملبوس اخبار کو الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ اس کو صرف سرخیاں دیکھنے میں دلچسپی تھی۔ سامنے شلغم نما چہرے والا شخص ابھی بھی تھوڑے وقفے کے بعد مسکرا کر نیم باز آنکھوں سے میرے برابر والی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا دہانہ بہت چھوٹا تھا اتنے بڑے چہرے پر چھوٹا سا دہانہ بڑا غیر موزوں لگ رہا تھا۔ چہرے پر احساس کمتری اور چوروں کی طرح لڑکی کو دیکھنا نسوانی قسم کے ہونٹوں پر ایک بھدی مسکراہٹ مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی یہ شخص کتنا بیچ اور بد صورت لگ رہا تھا۔ میں نے اس ناخوشگوار منظر کو چھوڑ کر حسب عادت ٹرین میں مسافروں کا سرسری جائزہ لیا۔ جیسے کہ میں اکثر کلاس روم میں طالب علموں کو دیکھا کرتا تھا اس کے بعد میری نگاہ کھڑکی کے شیشے کے اوپر لگے ہوئے پوسٹر پر پڑی اس سے اکتا کر کبھی کبھی مسافروں کو اترتے چڑھتے دیکھنے لگتا۔ شلغم نما چہرے والا شخص کہیں دور جا رہا تھا میری طرح۔ اس مرتبہ جو میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ اب بھی میرے برابر والی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اب وہ لڑکی کتاب نہیں پڑھ رہی تھی بلکہ گہری سوچ میں غرق تھی۔ اس دفعہ وہ شخص دیکھ رہا تھا مگر مسکراہٹ غائب تھی البتہ اس کے گھٹنوں پر جو ایک چمڑے کا چھوٹا سا بیگ تھا اسے مضبوطی سے ہتھیلیوں کے درمیان پکڑے بیٹھا تھا اور اپنی فربہ انگلیوں سے طبلہ سا بجا رہا تھا۔ ادھر ادھر بیٹھے ہوئے ایک دو شخص اس کی انگلیوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں نے اس میں کچھ دلچسپی نہ پا کر فرش کو گھورنا شروع کر دیا۔ لوگوں کی بجائے اگر فرش کو گھورا جائے تو کسی کو اعتراض نہیں ہوتا۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کو کوئی نوزی نہیں کہے گا اب شلغم نما چہرے والے کے جوتے نظر آ رہے تھے جوتوں میں کوئی خرابی نہ تھی اور اچھی طرح سے پالش بھی کئے ہوئے تھے۔ پہلی بار اس شخص کی کوئی چیز ایسی نظر آئی جس پر مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔ میں نے پھر اس کے چہرے پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اس مرتبہ وہ لڑکی کو ترچھی نگاہ سے نہیں بلکہ بے باکی سے دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں افسوس اور تاسف کے ساتھ غصہ بھی تھا۔ ممکن ہے اس نے لڑکی کے چہرے پر حقارت کے تاثرات دیکھے ہوں۔ مختصر سفر میں کسی کو بلاوجہ مسلسل دیکھنے سے افسوس کے علاوہ اور مل بھی کیا سکتا ہے۔ ٹرین کی آواز دھن دھن۔

د۔ دھن دھن سے کھٹاپٹ کھٹاپٹ میں تبدیل ہوگئی۔ سرنگ ختم ہورہی تھی۔ پلیٹ فارم اور نیا اسٹیشن آگیا تھا میں نے شلغم نما چہرے والے صاحب کو دوسروں کے جائزے کے لئے چھوڑا اور اٹھ کھڑا ہوا دھڑ سے دروازہ کھلا لوگ ایک دوسرے سے ملے ہوئے آہستہ آہستہ اترنے لگے پھر تیز تیز چلنے لگے اسکیلیٹر کے قریب پہنچتے پہنچتے قطاریں بھی بنتی جارہی تھیں۔ دائیں طرف لوگ صرف اسکیلیٹر پر کھڑے ہوتے جارہے تھے اس اسکیلیٹر پر دوسری قطار کے لوگ اوپر چڑھتے جارہے تھے۔ اسکیلیٹر پر کھڑے ہو کر کچھ لوگ اطمینان کا سانس لیتے ہیں کچھ لوگ بڑی احتیاط سے ادھر ادھر گردن گھما کر دوسری طرف سے گزرتے ہوئے اسکیلیٹر پر کھڑے ہوئے لوگوں کا جائزہ لیتے ہیں تجسس انسان کی فطرت میں ہے سرسری طور پر چہروں کا مطالعہ کرنا ایک فطری بات ہے ہر چہرہ اپنے ساتھ ایک افسانہ یا داستان لئے ہوتا ہے ان میں کتنی ہی کہانیاں سبق آموز بھی ہیں اور تلخ بھی مضحکہ خیز بھی اور قابل رشک بھی۔

اشارہ

بابولال بڑی شے تھا۔ داڑھی مونچھ صاف، چہرے پر سانولے رنگ کی کھال ایسے چمکتی تھی جیسے دیسی گھی کی مالش ہوئی ہو۔ میں اکثر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بڑے غور سے دیکھتا۔ اس کے چہرے کی ہر ادا کچھ معنی رکھتی تھی مگر جہاں تک اس کی گفتگو میں دوسرے لوگوں کی ذاتی تفصیلات کا تعلق تھا۔ میری طبیعت پریشان ہونے لگتی تھی۔ بابولال نے بھی دنیا دیکھی تھی۔ کسی وقت بابولال سمجھ جاتا۔ "مرجاجی تمہارا میری بات میں دھیان نہیں" بابولال مجھے متوجہ کرتا ..... "نہیں نہیں میں سن رہا ہوں۔" میں اصلیت کو چھپانے کی کوشش کرتا۔

بابولال کسی اور موضوع پر گفتگو چھیڑ دیتا۔ بابولال جب تک اپنی جیب سے سگریٹ نہ نکالے، گفتگو پائیدار نہیں ہو سکتی۔ بابولال پہلے سگریٹ کو اپنی سگریٹ کی ڈبیا پر ٹھکورتا جیسے کہ وہ یقین کرنا چاہتا ہو کہ سگریٹ جاندار ہے اور پینے کے قابل ہے۔ بابولال جیب میں ماچس یا سگریٹ لائیٹر رکھنے کا قائل نہ تھا۔

"ذرا سگریٹ لگوا یار" گیراج کا کوئی آدمی اپنی ماچس یا سگریٹ لائٹر نکال کر بابولال کی سگریٹ سلگا دیتا۔ بابولال اپنی مٹھی میں سگریٹ کو دبا کر لمبے کش لگاتا پھر گفتگو اپنے عروج پر چلی جاتی جس میں کاروبار کے جوڑ توڑ، کامیابیوں اور ناکامیوں کی داستانیں ہوتیں۔ بابولال کے چہرے پر گہرے رمز کے اشارے بہت کچھ کہہ جاتے۔ کبھی بابولال اپنی ایک آنکھ اور پوپلے دہانہ کو ذرا دباتا، کبھی آنکھوں میں اور اس کے ناک کے گرد کھیلتی ہوئی مسکراہٹ اس کی رنگین طبیعت کا پتہ دیتی۔ کبھی کھوکھلا قہقہہ غلط بھروسوں کا حوالہ ہوتا۔ بابولال نے تجارتی کاروبار میں کئی اتار چڑھاؤ دیکھے۔ لاکھوں کے کاروبار چند ماہ میں کھڑے کر دیئے۔

مگر پتہ نہیں اس کے ہاتھ کی لکیروں اور ہتھیلیوں کی بناوٹ میں کیا راز تھا کہ پیسہ ادھر سے آیا ادھر گیا۔

بابولال کبھی کبھی فلسفیانہ باتیں کرتا۔ "مرجاجی پیسہ ہاتھوں کا میل ہے پیسہ کوئی چیز نہیں،

پیسہ آنی جانی چیز ہے۔ کچھ اصول ہوں، آدمی محنتی ہو، تھوڑا دماغ ہو، پیسہ پھر آجاتا ہے۔"

بابو لال کی میں قدر کرتا تھا۔ وہ بڑا مہذب اور سمجھدار آدمی تھا۔ برف کی طرح ٹھنڈا یخ، غصے کا نام ونشان نہیں تھا۔ بڑے آدمیوں سے تعلقات پیدا کرنا، امیر لوگوں کو اپنے کاروبار میں پیسہ لگانے کے لئے قائل کرنا، بنکوں سے قرض لینا، یہ سب کھیل اس کو خوب آتے تھے جس طرح لوگ اس پر اعتماد کرتے یہ دوسروں پر بھروسہ کرتا۔ بھروسہ بھی ایسا بابو لال شراب کے نشے میں ڈوبے ہوئے ہیں اور کاروبار لٹ رہا ہے۔ ہوش آتا، تو معاملہ چوپٹ، ایک روز کہنے لگا "مرجاجی، یہی تو ایک چیز ہے جس کے سہارے میں زندہ ہوں۔ شراب کے بنا میں رہ نہیں سکتا" بابو لال نے سگریٹ کا آخری کش لگایا اور بچا ہوا سگریٹ پاؤں کے نیچے دبا کر رگڑا۔ "مرجاجی، ایک بات تو بتاؤ" بابو لال میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک طرف لے گیا۔ جہاں اس کے بیٹے کی آئیس کریم وین کھڑی تھی دین میں سے ایک پنجابی اخبار نکال کر لایا اور اونچی آواز میں پڑھنا شروع کر دیا۔ "مغل بادشاہوں کے آزمائے ہوئے کشتے اور اصل جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ دوائیں، ہم سے بذریعہ ڈاک حاصل کریں"

مرجاجی، مجھے یہ سمجھاؤ، مغل بادشاہوں کے نسخے کیا تھے، جو اس اخبار میں لکھا ہے۔ اس میں کچھ حقیقت بھی ہے "یارڈ میں ادھر ادھر پارک کی ہوئی آئیس کریم گاڑیوں کے ڈرائیور جو اپنی گاڑیوں کی صفائی وغیرہ کر رہے تھے۔ یا آئیس کریم کا سٹاک فریج میں رکھ رہے تھے۔ ان کے کان کھڑے ہوئے۔

بابو لال نے آگے پڑھنا شروع کیا۔ تو گیراج کے دوسرے لوگ موٹر ڈرائیورز اور سیلز مین آہستہ آہستہ بابو لال اور میری گفتگو سننے کے لئے آگے بڑھے۔

اتنے لوگوں کو ارد گرد دیکھ کر بابو لال ذرا شوخی میں آگیا۔ اپنی بزرگی کو ایک طرف کر کے اب وہ مزاح کے موڈ میں تھا۔ نوجوان جو ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔ یہ سب جاننا چاہ رہے تھے کہ آخر اس اخبار میں مردانہ دواؤں، مغل بادشاہوں کے کشتوں کا مرجاجی سے کیا تعلق ہے۔ گیراج کے مالک جگندر نے جب یہ جمگھٹا دیکھا تو وہ بھی سیلز کاؤنٹر چھوڑ کر آگیا۔

بابو لال نے ڈرامائی انداز میں میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

"بھئی مرجاجی بھی تو مغل ہیں۔ اس لئے انہیں مغل بادشاہوں کے نسخوں کا زیادہ پتہ ہو گا"

بابولال پھر سے مخاطب ہوا "دراصل میں آپ کو صاف بات بتاؤں سولہ سال پہلے میری بیوی کار کے حادثہ میں ہلاک ہوگئی تھی "یہ کہنے کے بعد بابولال نے گہرا سانس لیا۔ سب لوگ خاموشی سے بابولال کی پوری بات کا انتظار کرنے لگے۔

"میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں "یہ کہہ کر بابولال پھر خاموش ہوگیا۔

"آگے پوچھ نا بابولال "چار پانچ آوازیں آئیں۔

"دراصل مرجاجی بات کرتے بھی شرم آتی ہے "یہ کہتے ہوئے بابولال ایک پھیکی سی ہنسی ہنسا۔۔۔

"منہ توں پھٹ "جگندر نے کہا۔

"ڈرتا کیوں ہے؟ کھل کر بات کر بابولال "ایک آواز آئی۔

"اصل میں بات یہ ہے مرجاجی "بابولال نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنی بیوی سے بڑا پیار تھا۔ اس میں سب خوبیاں اور مجھ میں تمام برائیاں تھیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ی لہ وہ کسی سے نفرت کرنا جانتی ہی نہ تھی اچھے برے حالات میں ہمارے گھر جب بھی کوئی مہمان آتا میرا ہو یا اس کا اپنا جو کچھ گھر میں ہوتا آگے رکھ دیتی۔ خراب سے خراب حالات میں بھی وہ کبھی گھبرائی نہ تھی۔ میرے لئے تو وہ دنیا میں جنت تھی۔ اس کے مرنے کے بعد میں نے کبھی عورت کے متعلق سوچا ہی نہ تھا۔ اب چند مہینوں سے مجھے خیال آرہا ہے کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں یا کوئی نقص ہے۔ یہ بات میرے لئے کچھ پریشان کن ہے۔ "ارد گرد کھڑے ہوئے نوجوانوں میں سے کسی نے بابولال کی بات کا صاف لفظوں میں اور پنجابی میں ترجمہ کیا۔ اس پر ایک زوردار قہقہ لگا۔

بابولال برا ماننے کی بجائے۔ جھینپا۔ جھینپا خود بھی ہنسنے لگا۔

"میں نے کہا ،اس کا علاج ہے اور بڑا آسان ہے "۔ ایک بار پھر خاموشی چھاگئی۔

ایک دو گردنیں ذرا اور آگے جھکیں۔ تاکہ میری بات اچھی طرح سن سکیں۔

"دواؤں اور مغلوں کے کشتوں کی بات چھوڑیں۔ پہلے ایک سادہ سا علاج آزما کر دیکھیں "میں نے کہا۔۔۔ "مرجاجی بتائیں یہ نسخہ تو شاید ہمیں بھی کبھی کام آجائے "جگندر نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ میں بھی شرارت کے موڈ میں آگیا اور چاہتا تھا کہ بابولال کی شروع کی ہوئی بات ذرا

جاری رہے اور اس کا مزہ لیا جائے۔ ذرا خاموشی ہوئی تو میں نے کہنا شروع کیا۔

"بابو لال ایک ہفتہ تک بہت عمدہ قسم کی بریانی کھاؤ۔"

"بریانی کی ہوندی اے؟" بابو لال نے پوچھا۔

ہنستے ہوئے ایک دو آوازیں آئیں "ہاں مرجاجی او کی ہوندی اے؟"

"جس پلاؤ میں گوشت زیادہ ہو اور چاول کم وہ بریانی ہے۔ اس کے چاول مختلف رنگوں سے رنگ کر ملائے جاتے ہیں۔ مگر ان کے رنگنے یا نا رنگنے سے اس کے ذائقے یا تاثیر میں کچھ فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی تمہارے علاج میں کچھ فرق آئے گا" میں نے بریانی کی مزید تشریح کرتے ہوئے کہا "اگر ایک سیر گوشت میں ایک پاؤ چاول پکائے جائیں۔ تو یہی بریانی ہے۔ یہ ایک ہفتہ کھا کر دیکھیں تم میں اگر کوئی نقص نہ ہوا تو اشارہ ضرور ہو گا۔

بابو لال نے کچھ یقین کرتے ہوئے گردن ہلائی

"بھئی بابو لال یہ نسخہ تو بڑا اعلیٰ ہے۔ ہم بھی آزما کر دیکھیں گے "جگندر یہ کہتے ہوئے اپنے سیل کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ دوسرے لوگ بھی مجھے اور بابو لال کو مزید گفتگو کے لئے چھوڑ کر اپنی اپنی آئس کریم گاڑیوں کی طرف چلے گئے۔ میں نے مزید اپنی معلومات سے بابو لال کو متاثر کرنے کی کوشش کی اور سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔

"دراصل بابو لال جی، جنسی جذبے کا تعلق انسان کے خیالات سے بھی ہے۔ اگر اس کے متعلق ذہن میں کوئی بات نہ ہو اور عملی طور پر بھی دستبردار ہو جائیں تو یہ جذبہ دب جاتا ہے۔ مرد کو ساٹھ پینسٹھ سال کی عمر تک کچھ نہیں ہوتا۔ وہ چاہے تو قائم رہتا ہے۔ اچھی صحت کا مرد اس سے بھی کئی سال آگے نکل جاتا ہے تم تو ابھی پچاس سے بھی کم ہو" میں نے بابو لال کو خوش کرنے کے لئے چند برس کم کر دیئے۔

بابو لال کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ڈھلکی ہوئی کھال میں چمکنے لگیں اور اس نے اپنی خود اعتمادی کو بحال کرتے ہوئے ناک کو ذرا سا ہلایا۔ اس کے بعد بابو لال سے کوئی دس بارہ روز تک ملاقات نہ ہوئی۔ پھر ایک دن اپنی کار گیراج سے نکال رہا تھا کہ بابو لال نے اپنی کار سے نکل کر زور زور سے ہاتھ ہلائے۔ "مرجاجی، اک منٹ ذرا مری گل سن کے جانا"

میں گاڑی سے اترا اور اس کے پاس گیا۔ تو بابو لال بڑے خوش تھے

"کمال ہو گیا مرجاجی میرا تے کم ہو گیا۔ (میرا تو کام ہو گیا)۔

پچھلے دنوں میں ایک ریسٹورنٹ میں جاکر بریانی کھاتا رہا۔ آٹھ روز خوب بریانی اور کباب کھائے یہ نسخہ مزیدار بھی ہے اور مفید بھی۔

بابولال سے اس ملاقات کے دو ماہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ بابولال نے ایک امیر بیوہ سے شادی کرلی ہے اور یہ کہ اب وہ سگریٹ کی ڈبیا کے ساتھ ساتھ ایک سگریٹ لائیٹر بھی اپنی جیب میں رکھتا ہے۔

دلّا کوچوان

دلّا بیچارہ نہایت ہی شریف آدمی تھا۔ نہ کسی کی برائی میں نہ اچھائی میں۔ سادہ ایسا کہ بات کیسی بھی ہو اس کو سمجھ آئے نہ آئے۔ "ہنس دیتا"۔۔۔ سانولے سے بھی ذرا پکا رنگ، ناٹا قد، وہی نیلے رنگ کی دھوتی جو ٹخنوں سے اوپر لہراتی رہتی پھجا سی کالی ڈاڑھی، جس میں ایک آدھ بال سفید کہیں کہیں چمکتا دکھائی دے جاتا۔ سر پر دو تین بل دیئے ہوئے مختصر سی نیلے رنگ کی پگڑی اور خاکی رنگ کی سرکاری قمیض پہنے ہوئے، دلا غضب کی پھرتی سے چلتا۔ دور سے چلا آرہا ہو تو معلوم ہوتا کہ کوئی ریچھ گرداڑاتا ہوا چلا آرہا ہے۔ دلا پچھلے بیس پچیس سال سے بگھی خانہ کا ملازم تھا مگر اپنی کمزور شخصیت اور سادگی کی وجہ سے صرف سائیس ہی رہا۔ لے دے کر ایک بوڑھی ماں اور ایک بیوی تھی گیارہ روپے تنخواہ میں وہ اپنی گذراوقات کر لیتے تھے۔ دلا کو اپنی ترقی نہ ہونے کا افسوس نہ تھا۔ اس کو احساس تھا کہ نہ تو وہ قدآور جوان تھا۔ نہ ہی اس سے دو گھوڑوں کی بگھی سنبھل سکتی تھی۔ کسی وزیر یا بڑے افسر کی ڈیوٹی پر جاتا تو ان کی بات بھی سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ اس سے مطمئن تھا کہ کبھی کبھار سرکاری ٹانگہ چلانے کو مل جاتا تھا۔ ورنہ دلا عام طور پر تھکے ہوئے گھوڑوں کو بگھی خانہ میں ٹہلاتا تھا۔

ایک دن دلا نے بگھی خانہ کے دروازہ میں داخل ہوتے ہی جب داروغہ جی کو برآمدہ میں کھڑے دیکھا، تو انکساری سے سلام کرتے ہوئے گزرنے لگا۔ داروغہ جی نے اپنی کڑک دار آواز میں اسے بلایا۔

دلا تقریباً دوڑتا ہوا واپس آیا۔

"جی داروغہ جی" دلا نے کہا۔

"میرے ساتھ آ" داروغہ جی یہ کہتے ہوئے برآمدے سے گزر کر اپنے پرائیویٹ اور ایک وسیع کمرے میں داخل ہوئے کمرے کے دروازے کے ساتھ ہی برآمدے میں پرانی وضع کا ٹیلیفون لگا ہوا تھا۔

داروغہ جی اس ٹیلیفون کے نزدیک ہی دیوار پر لٹکی ہوئی چابیاں لے آئے۔ اور کچھ سوچنے

لگے۔ دلے کو بھی سوچنے کا موقع مل گیا۔

دلا سوچنے لگا" اگر میرا رنگ داروغہ جی کی طرح سرخ و سپید ہوتا اور آنکھیں ان کی طرح چمکتی ہوئی بھورے رنگ کی ہوتیں تو میں بھی پورے بگھی خانہ کا داروغہ ہوتا یہ سوچ کر اسے خود ہی ہنسی آگئی اور اس کا اوپر کا ہونٹ اور اوپر کو گھوم گیا جو پہلے ہی ذرا اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی طرح کے دانت نظر آنے لگے "بے وقوف گدھے ہنستا کیا ہے" داروغہ جی غرائے۔

داروغہ جی نے بجلی کی سی طرح سے کونے میں پڑا ہوا چابک اٹھالیا" حرامزادے ہنستا کیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں ؟"

دلا ہاتھ جوڑ کر کانپنے لگا۔ دلا پرانے ملازموں میں سے تھا۔ دلے کو یقین تھا کہ وہ اسے نہیں ماریں گے۔ لیکن پھر بھی ہاتھ جوڑ دیئے۔ داروغہ جی کا کیا جاتا ہے۔ ایک آدھ لگا ہی دیں۔ بگھی خانہ کے دروازہ کی طرف سے ایک شور سا اٹھا جو کہ داروغہ جی کے کمرے اور برآمدے کے ساتھ ہی ملا ہوا تھا۔ ایک لینڈو یعنی دو گھوڑوں کی بگھی اور اس کے بعد ایک فٹن (وکٹوریہ) داخل ہوئی۔

بگھیوں اور گھوڑوں کے گزرنے کا شور ختم ہوا تو داروغہ جی کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

داروغہ جی نے دلے کو چابیاں دیں اور کہا" چل ذرا اسٹور کھول"

"جی صاحب" دلے نے مؤدبانہ کہا۔

بگھی خانہ کے درمیان ہی ایک بڑا اسٹور تھا۔ تین چار فٹ اونچے پلینتھ پر ایک وسیع عمارت تھی۔ جو ایک قلعہ دکھائی دیتی تھی۔ بڑے بڑے دروازے روشندان اور شیشے لگے بڑی بڑی کھڑکیاں، جن پر دھول پڑی رہتی تھی۔ لگتا تھا برسوں سے کسی نے اندر بھی نہیں جھانکا۔ تالوں اور کنڈوں پر کافی مٹی جمی تھی۔ عمارت کے چاروں طرف برآمدہ تھا جن کی چھتوں کے ساتھ بے شمار ابابیلوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ دلا نے تالا کھولا پھر آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اندر داخل ہوا تو نا معلوم سا خوف اس کے دماغ پر طاری ہو گیا۔ اس کا جی چاہا فورا باہر آجائے لیکن یہ سوچ کر کہ ان خالی کمروں میں کیا ہو سکتا ہے، وہ کے وہیں کھڑا رہا۔ باہر بگھی خانہ کے ملازموں کی، گھوڑوں کے پھرپھرانے اور ہنہنانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ دلا ہال کمرے کو چھوڑ کر دوسرے اور پھر تیسرے کمرے میں داخل ہوا۔ شیشے کی قد آدم الماریوں میں سرخ نیلی اور سنہری زرق برق

وردیاں لٹک رہی تھیں۔ دلاان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا ماضی کی دھندلی تصویریں اس کے دماغ میں ابھرنے لگیں۔ دلاان وردیوں کو خوب پہچانتا تھا کہ یہ وردیاں کس کس کی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر لوگوں کو اس نے خود ان وردیوں میں دیکھا تھا۔ کئی ماہر کوچوان دفعدار حتیٰ کہ بڑے داروغہ جی اور پھر ان کے والد یعنی موجودہ داروغہ کے دادا کی وردیاں بھی لٹک رہی تھیں۔ چمڑے کے فل بوٹ ایسے پڑے ہوئے تھے جیسے کہ ان لوگوں نے ابھی ابھی استعمال کئے ہوں۔ برآمدے میں ایک دو پرندے پھڑپھڑائے۔ اس کا دل دھک سے ہوا اور وہ جلدی سے باہر آنے لگا۔ تو داروغہ جی کمرے میں کھڑے الماریوں کے سامان کا جائزہ لے رہے تھے، جس میں کچھ جلوسی سامان، گھوڑوں کے نئے ساز، بگھیوں کی خوبصورت لالٹینیں رنگ برنگ چابک قلبے اور پگڑیاں لٹکی ہوئی تھی۔ داروغہ جی مختلف الماریوں کو گھوم گھوم کر دیکھ رہے تھے۔ دلا ابھی تک مرنے والوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ جن کی شاندار وردیاں خالی خالی سی اب شیشوں کے پیچھے لٹک رہی تھیں۔ یہی لوگ کس شان و شوکت کے ساتھ گھوڑوں اور بگھیوں پر اکڑ اکڑ کر بیٹھتے تھے۔ مگر آج دلا طنز اور افسوس کے ملے جلے جذبات میں بت بنا کھڑا تھا۔

اچانک داروغہ جی دلے سے مخاطب ہوئے "اس مرتبہ جلوس میں جانے والی بگھیوں میں تم بھی جاؤ گے۔"

دلا کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اسے ایسے لگا جیسے باہر پرندے پھڑپھڑائے ہیں۔۔۔۔

"ہیں جی" دلا نے تذبذب ہوتے ہوئے کہا۔

"اگلے ماہ راجہ کی لڑکی کی شادی میں جو مہمانوں کے لئے بگھیاں ہوں گی اس میں سے ایک فٹن تم لے کر جاؤ گے۔"

داروغہ جی نے اس کی وضاحت کی۔

"نا جی۔ داروغہ جی" دلا نے معذرت کے انداز میں ہاتھ ہلائے۔

باہر سے کسی کی آواز آئی "داروغہ جی جلدی آئیں، جرنیل صاحب کا ٹیلیفون ہے۔"

داروغہ جی نے آدھا جلتا ہوا سگریٹ پھینکا اور تیزی سے چلتے ہوئے بگھی خانہ کے دروازے کی طرف چلے گئے جہاں ٹیلیفون تھا۔ تھوڑی دیر بعد بگھی خانہ کے تمام عملے کو اکٹھا کیا گیا اور

داروغہ جی نے اعلان کیا" کہ اگلے ماہ چودہ تاریخ کو راجہ کی لڑکی کی شادی ہے۔ جلوس پورے شہر میں بڑی سڑک سے گزر کر قلعہ تک جائے گا۔ اس میں دو جوکڑے، جس میں ایک سونا چاندی کی بگھی ایک جلوسی بگھی، چار لینڈوز اور چھ فٹن جائیں گی۔ ان بگھیوں پر وہی لوگ ڈیوٹی پر جائیں گے۔ جو لوگ ٹکہ صاحب کی شادی پر تھے۔ فضلا کیونکہ بیمار ہے۔ اس کی جگہ دلا ایک فٹن لے کر جائے گا۔

سب لوگ اس خبر پر ہنس پڑے۔ "دلا اور سرکاری جلوس"

اگلے روز بگھی خانہ کے تمام ملازم وقت سے پہلے پہنچنے لگے۔ گھوڑوں کی خوراک بڑھادی گئی ۔ مالشیں تیز ہو گئیں۔ نئے ساز و سامان سٹور سے نکل آئے۔ وردیاں دھلنے کے لئے جانے لگیں۔ جلوسی بگھیاں فراش خانے سے آگئیں۔ بگھیوں کے پہیے نکال کر نئی گریس دی جانے لگی۔ گھوڑوں کی نئی نعل بندی شروع ہو گئی۔ ان کی ریاں اور کھال کے بالوں کی کانٹ چھانٹ ہونے لگی۔ سلوتری نے گھوڑوں کی صحت کا جائزہ لینا شروع کر دیا داروغہ جی خود بھی گھوڑوں کو باری باری مختلف بگھیوں میں ٹرائیل پر لے جانے لگے اور شہر کے مختلف دروازوں اور بازاروں سے لے کر گزرتے تاکہ گھوڑے وقت پر یعنی جلوس نکلتے وقت اڑنے نہ لگیں۔

شادی سے دو روز پہلے پورا جلوس اپنے اصل راستوں سے گزرا اور یہ ریہرسل نہایت کامیاب رہی اور کوئی خرابی پیدا نہ ہوئی۔

جیسے جیسے شادی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ شہر کی آخری نوک پلک ٹھیک کی جا رہی تھی۔ تمام سڑکیں اور عمارتیں، جھنڈیوں، بجلی کے قمقموں اور خوشنما سنہری بینرز سے سجائی جا رہی تھیں۔ جگہ جگہ مہراجی دروازے بنائے گئے تھے۔ ہر دکاندار نے بڑھ چڑھ کر اپنی دکان کو سجانے کی کوشش کی تھی ۔ مٹھائی والوں نے اپنی مٹھائیوں پر زیادہ فراخدلی سے چاندی کے ورق لگائے تھے ۔ ہندو دوکانداروں نے زرد اور بسنتی رنگ کی پگڑیاں سر پر سجالی تھیں۔ بچے سکول میں تین چھٹیاں ہونے پر خوش تھے اور اسکولوں میں مفت مٹھائی ملنے کی باتیں کر رہے تھے۔ عورتیں اپنے دوپٹے رنگنے اور مسی کجلا میں مصروف تھیں۔ سرکاری افسروں، جاگیرداروں کے گھروں میں ملازمین کی بھاگ دوڑ ایسے ہو رہی تھی جیسے کہ انہیں کے گھر پر کسی کی شادی ہے۔ سڑکوں پر ماشکی اور سرکاری پانی کی گاڑی چھڑکاؤ میں مصروف تھے۔ کتے شہر کی اچانک گہما گہمی سے پریشان تھے کچھ کتے جنہیں اس

شادی میں کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی یا پولیس والوں کے ڈنڈوں اور پتھروں سے محفوظ رہنا چاہتے تھے۔ وہ گلی محلوں میں چلے گئے ایک آدھ صحت کی خرابی یا اپنی زخمی ٹانگ کی وجہ سے کسی حلوائی کی دکان کے نیچے دبک کر بیٹھ گیا۔

داروغہ جی کا عملہ تو بگھیاں اور گھوڑوں کی تیاری میں مصروف تھا ہی۔۔ ہاتھی خانہ والے بھی کم مصروف نہ تھے۔ ہاتھیوں کو مختلف رنگوں سے سجایا جارہا تھا۔ سنہری ہودے چمکائے جارہے تھے۔ فوجی جوانوں میں سے چن کر خاص دستے تیار کیئے گئے تھے۔ رسالہ کے گھوڑوں اور ان کے سواروں پر توجہ دی جارہی تھی۔ پائپ بینڈ اپنی خاص دھنوں کی پریکٹس کر رہے تھے۔

ان تمام مصروفیات میں ایک دلا تھا۔ جس کی چھوٹی سی دنیا تھی۔ بے فکر ٹانگیں پھیلائے سو رہا تھا۔ چار بجے کی توپ چلی تو بیوی نے اسے جگایا۔

"اجی اٹھو صبح ہوگئی ہے۔"

دلا ہڑبڑا کر اٹھا۔ ہینڈ پمپ کے نیچے بیٹھ کر تازہ پانی سے نہایا۔ چار رکعت نماز کی پڑھیں۔ دو گرم گرم نمک والی روٹیاں لسی سے کھائیں اور بگھی خانہ کی طرف چل دیا۔

دلا کو یاد آیا کہ اس نے ایک مرتبہ بڑی حماقت کی تھی۔ ایک لیڈی ڈاکٹر جو کہ ادھیڑ عمر تھیں۔ انہیں بگھی میں اکیلا چھوڑ کر، سگریٹ کی دکان پر اپنے لیئے بیڑی خریدنے چلا گیا۔ اچانک کسی شور سے گھوڑا بدک گیا۔ اور لیڈی ڈاکٹر سمیت بگھی کو لے کر ایسا سرپٹ دوڑا کہ دلا کے شور مچانے اور پیچھے بھاگنے پر بازار میں لوگوں نے گھوڑے کو روکنے کی انتہائی کوشش کی مگر گھوڑا نہ رکا اور سیدھا بگھی خانہ پہنچ گیا۔

لیڈی ڈاکٹر بھی کتنی نیک عورت تھی اس نے جب داروغہ جی کو غصے سے بھرا دیکھا تو کہنے لگی۔ "داروغہ جی جو ہوا سو ہوا۔ اس کی رپورٹ نہ کیجیئے۔"

اسی وجہ سے دلا حیران تھا کہ داروغہ جی نے اسے جلوس میں بھیجنے کا فیصلہ کیسے کر لیا۔؟

چلتے چلتے دلا سوچنے لگا۔ "جب وہ نئے سرکاری لباس میں بگھی چلا رہا ہوگا۔ لوگوں سے بھری ہوئی سڑکوں، عورتوں اور بچوں سے لدی ہوئی چھتوں سے ہزاروں نگاہیں مجھ پر پڑیں گی تو میری بیوی کس فخر سے مجھے دیکھے گی اور کہے گی۔"

"دیکھو وہ میرا دلّا ہے۔"

اپنے محلے سے نکل کر جب وہ سڑک پر آیا۔ تو کچھ لوگ نظر آنے لگے۔ نمازی تیز تیز قدم اٹھائے مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ ایک ہندو چھڑی لئے دو ایک پانی کی گڑوی لئے شہر سے باہر کی طرف جا رہے تھے۔ ایک آدھ ٹانگہ پاس سے گزرا دودھ کی دکانوں والے اپنی انگیٹھیاں اور چولہے سلگانے میں لگے تھے۔

دلاّ رنگیں، جھنڈیوں اور خوبصورت دروازوں سے گزرتا ہوا۔ گھنٹہ گھر کے سامنے اور ڈاک خانہ کے پاس پہنچ گیا۔ اب دن نکلنے والا تھا۔ دلا بگھی خانہ کے دروازے میں داخل ہوا تو پہلے ہی سے کافی لوگ موجود تھے۔ بگھیوں کو باہر نکالا جا رہا تھا۔ تمام سائیس، خلاصی، کوچوان، دفعدار، جمعدار ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے گھوڑے اپنے تھانوں سے کھول کر لائے جانے لگے۔ گھوڑے اچھل کود کر کے اپنی طاقت اور سرکشی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ تمام سائیس اور خلاصی اپنی خاکی وردیوں میں گھوڑوں کو بڑی تیزی سے ساز پہنا رہے تھے۔ کوچوان، دفعدار تیار ہو کر اپنی بگھیوں کے کوچ بکس پر بیٹھ گئے ان سب نے زرد رنگ کی پگڑیاں اور خاکی رنگ کے کوٹ پر سنہری پٹکے باندھ رکھے تھے تمام بگھیاں ایک وسیع قطار میں کھڑی ہو گئیں۔

دلاّ آخری بگھی پر کچھ شرمایا ہوا سا بیٹھا تھا۔

جمعدار اکبر بیگ نے تمام بگھیوں کا بغور جائزہ لیا اور جلوسی بگھی کے کوچ بکس پر بیٹھ گئے۔

داروغہ صاحب کسی دولہا میاں کی طرح چمکتی ہوئی زری کی پگڑی، شیروانی، سفید چوڑی دار پائجامہ پہنے اپنے کمرے سے باہر نکلے۔ ہاتھ میں ایک نیا چابک لیے چار گھوڑوں کی سونے چاندی کی بگھی کے کوچ بکس پر تیزی سے جا بیٹھے۔ اور راسیں ہاتھ میں لے کر ایک رعب دار آواز میں بولے ۔"چلو" بادامی رنگ کے چاروں گھوڑے خراماں خراماں چلنے لگے۔

"شاباش بیٹے۔ شاباش" داروغہ نے دو چار بار کہا۔ دوسری بگھیاں بھی تھوڑا سا فاصلہ رکھ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئیں۔

پروگرام کے مطابق راجہ کی بیٹی کی بارات شہر کے ریلوے اسٹیشن پر خاص ٹرینوں کے ذریعے پہنچی۔ تمام بارات ریفریشمنٹ اور چند ایک رسومات کے بعد بگھیوں اور ہاتھیوں پر سوار

ہوئی اور باقاعدہ جلوس کی شکل میں پٹیالہ دروازہ کے باہر کھڑی ہوگئی۔ آگے سرکاری بینڈز پھر رسالہ کے گھڑسوار دولہا کے ساتھ آنے والے خاص مہمان ہاتھیوں پر سوار تھے۔ اس کے بعد سونے چاندی کی بگھی جس میں دولہا اور ایک دو خاص مہمان تھے۔ بگھی کے دونوں طرف ننگی تلواریں لئے گھوڑوں پر سوار فوج کے اعلیٰ افسران اس کے بعد تمام بگھیاں جس میں تمام بارات سوار تھی۔

گیارہ توپوں کی سلامی پر جب پہلی توپ کی آواز آئی۔ تو جلوس پٹیالہ دروازہ سے شہر میں داخل ہوا سنگرور شہر نے اتنی خلقت اور انتظامات پہلے کم ہی دیکھے تھے۔ سنگرور کے قریب تمام شہروں اور ہر ایک گاؤں سے اس اہم جلوس کو دیکھنے کے لئے لوگ ٹوٹ پڑے تھے دو تین گھنٹے پہلے پولیس نے ہر طرح کی ٹریفک کو روک دیا تھا۔ تمام سڑکوں سے لوگوں کو ہٹا دیا گیا تھا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر پولیس کی قطاریں ہجوم کو روکے ہوئے تھیں۔ ہر شخص اپنی جگہ جم کر کھڑا ہوا تھا۔ چھتوں پر عورتیں بچے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تھے۔

اچانک آسمان پر کالی گھٹا آئی اور گہرے بادل قلابازیاں کھانے لگے۔ انتظامیہ کے لوگ گھبراہٹ اور فکر مند نظروں سے آسمان کو بار بار دیکھتے تھے مہاراجہ رنبیر سنگھ، ولی عہد اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد کو توالی کی دوسری منزل کے برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے جلوس کا انتظار کر رہے تھے۔ وزیر اعظم اور دوسرے وزرا بھی ساتھ موجود تھے۔ تمام لوگ بے چینی سے جلوس کا انتظار کر رہے تھے۔ دور سے بینڈ باجوں کی مدہم آواز آرہی تھی۔ جس سے جلوس کی روانگی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ بڑے چوک میں چھتوں پر لدے ہوئے لوگ اپنی گردنیں آگے بڑھا کر جلوس کو دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بینڈ باجوں اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے ملا جلا ایک شور سا بڑھتا جا رہا تھا۔ روتے ہوئے بچے خاموش ہوگئے۔ لوگوں کی چہ مگوئیاں بند ہوگئیں دولہا کو دیکھنے کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ جلوس نہایت منظم اور پوری رنگینیوں کے ساتھ چوک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آسمان پر بجلی کوندی پھر گڑگڑاہٹ سی ہوئی۔ تھوڑی بوندا باندی شروع ہوگئی تمام لوگ بارش میں اپنی جگہ اسی طرح کھڑے یا بیٹھے رہے جہاں تھے۔

ایک بار پھر زمین و آسماں بجلی کی چمک سے سفید ہوگئے۔ زوردار کڑک سے دھماکہ ہوا اور زور و شور سے بارش ہونے لگی۔ جلوس کے ڈسپلن میں کچھ فرق نہ تھا دولہا نے جنرل بلدیو سنگھ سے جو

گھوڑے پر سوار تھے کہا۔

"ہم لوگ پانی میں بھیگ رہے ہیں۔ بگھی کی ۔ ۔ بند کروا دیں۔"

گستاخی معاف یہ نہیں ہو سکتا دولہا صاحب" بلدیو سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمام شہر پانی میں بھیگ رہا ہے۔ پبلک اور راجہ صاحب کئی گھنٹے سے جلوس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور سب آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں" بلدیو سنگھ نے پھر کہا۔

راجہ صاحب افسروں، فوجیوں، دیگر ملازموں کے ڈسپلن، ان کی وردیوں، گھوڑوں، اور بگھیوں کو بغور دیکھ رہے تھے۔ رسالہ سوار، ہاتھی خوبصورت وردیوں میں ملبوس پائپ بینڈ، کوچوان، دفعدار، داروغہ بگھی خانہ، جنرل بلدیو سنگھ، دولہا، باراتی شہر کے تماشائی بارش کے پانی سے شرابور ہو رہے تھے۔

جب آخری بگھی کے کوچ بکس پر بیٹھا ہوا دلا کوچوان چند باراتیوں کو لیے ہوئے راجہ کے سامنے سے گزرا تو آس پاس کھڑے ہوئے وزرا نے دلا کو دیکھتے ہی گھبرا کر راجہ کی طرف دیکھا۔ راجہ کے پاس کھڑے، شاہی خاندان کے بچے ہنس رہے تھے ایک دو نے شرارتاً اور طنزاً سے تالی بجائی۔ راجہ صاحب نے اپنا سگار زمین پر پھینک دیا۔ "یہ کون ہے جو آخری بگھی چلا رہا ہے؟" راجہ نے پاس کھڑے کسی وزیر سے پوچھا دلا نے اپنے آپ کو بارش سے بچانے کے لئے ایک پرانی برساتی سے گھونگھٹ سا نکال رکھا تھا۔ دلا نہیں چاہتا تھا کہ اس کی نئی وردی پانی سے خراب ہو۔ یہ بات دلا کی سمجھ سے باہر تھی کہ اتنی قیمتی وردیاں پانی میں کیوں بھگوئی جا رہی ہیں اتنے سارے لوگوں کو پانی میں بھیگتے دیکھ کر دلا برساتی میں منہ چھپائے ہنستا رہا۔ راجہ صاحب اس مرتبہ انگریزی زبان میں گرجے "یہ کون ہے"؟ پاس کھڑے ہوئے ایک وزیر نے کچھ ہکلاتے ہوئے کہا۔ "ک ک۔ کوچوان"

برآمدے میں بیٹھے ہوئے شاہی خاندانی کے کچھ افراد زور سے ہنسے اور چپ ہو گئے۔

مگر بچے دیر تک "ک ک۔ کوچوان کہہ کر ہنستے رہے۔ بارش رک گئی تھی۔ مگر دلا ابھی بھی برساتی لپیٹے ہوئے تھا۔ برساتی سے صرف ایک آنکھ آزاد تھی۔ جس سے وہ اپنے گھوڑے کو چلتے ہوئے دیکھ سکتا تھا جب جلوس قلعہ کے نزدیک پہنچا تو دلے نے برساتی اتار دی اور اسکی نظریں اپنی بیوی کو تلاش کرنے لگیں۔ مگر اتنی بھیڑ بھاڑ میں اس کا دکھائی دینا مشکل تھا قلعہ میں سواریاں اتارنے

کے بعد جب دلا واپس شہر کے چوک سے گزر رہا تھا تو سڑکوں پر اتنی بھیڑ نہیں تھی۔ تیز رنگ برنگی روشنیوں میں کچھ فاصلے پر ایک عورت ہاتھ ہلا رہی تھی۔ دلا کی بگھی جب قریب پہنچی تو دلا نے پہچانا اس کی بیوی۔ نے دلا کی بوڑھی ماں کو بازو سے سہارا دے رکھا تھا۔ دلا نے فٹن کو روکا اور ان کو جلدی سے بگھی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ان کے بیٹھنے کے بعد گھوڑے کو ہلکا سا چابک لگایا تاکہ جلدی سے انہیں گھر چھوڑ کر پھر بگھی خانہ پہنچ جائے۔ ساس بہو نے آنکھوں کے علاوہ پورے چہرے ڈھانپ رکھے تھے۔ کبھی روشنیوں کا نظارہ کرتیں۔ کبھی دلا کی طرف دیکھتیں گیارہ روپے ماہوار تنخواہ والے دلا کا یہ خاندان آج بہت خوش تھا۔